ذکرِ اقبال

حضرت علامہ اقبالؒ کی سوانح حیات

از

عبد المجید سالک

قیمت :- ~~بارہ روپے پچاس پیسے~~

ناشر :- چمن بکڈپو ۔ اردو بازار دہلی

مطبوعہ :- جمال پریس دہلی

فہرس

رہے۔ سر سید سے روابط۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نور الدین سے تعلقات
قرآن سے شیفتگی۔ غریب پروری شاگرد نوازی۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی۔

عرضِ حال

انسانوں نے اپنی محبوب شخصیتوں کے حالات و کوائف کی یاد کو محفوظ رکھنے میں ہمیشہ اہتمام کیا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پیشوایانِ مذاہب، اولیاء اللہ، سلاطین و فاتحین، قائدین و مصلحین، ادباء و شعراء اور جلیل القدر اہلِ علم کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں تاکہ ان نسلوں کی تشنگی معلومات فرو ہو جنہیں ان اکابر کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ انسان کا یہ ایک فطری خاصہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے اکابر کا ذکر سن کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ کاش میں بھی ان کے زمانے میں ہوتا! یہی معیت و رفاقت کی خواہش ہے جس نے سوانح عمری کو جنم دیا اور وہی سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحبِ سوانح کی شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہو اور ان تمام جزئیات کا تذکرہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیت کا بولتا چالتا تصور پڑھنے والے کے ذہن میں آ جائے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر میں صرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی ایسی ہے جو کروڑوں نہیں بلکہ اربوں انسانوں کی قلبی محبت کا مرکز رہی ہے اور آج تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی محبوبیت کا دائرہ اتنا وسیع ہو۔ اس کائنات

میں بڑے بڑے انبیاء، اولیاء، اوتار، رشی اور دوسرے بڑے آدمی گزرے ہیں، لیکن آنحضرت صلعم کا مقامِ محبوبیت ان سب سے بلند تر ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کے اقوال و افعال کے تذکروں کی فراہمی میں صدیوں تک محنت کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک لمحہ کا ریکارڈ محفوظ اور مدون ہو چکا ہے۔ دنیا کی کوئی شخصیت اس اعتبار سے آنحضرت پر فوقیت لے جانا تو درکنار، ان کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکی۔ اس امتیاز کی ایک وجہ تو شخصیت کی محبوبیت ہے اور ہر مسلمان کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ تاسف پیدا ہوتا ہے کہ افسوس! ہم آنحضرت کے زمانۂ اقدس میں نہ ہوئے۔ چنانچہ سیرت نگاروں اور محدثوں نے اسی عام تشنگی کو بجھانے کے لئے آنحضرت صلعم کے زیادہ سے زیادہ ذاتی و شخصی حالات فراہم کر دیئے تاکہ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں اس محبوب شخصیت کا ایک پسندیدہ تصور قائم ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مومنوں کو بار بار ہدایت فرمائی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب بننا چاہو تو رسول صلعم کا اتباع کرو اور انہیں کی زندگی تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے یعنی حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و کوائف کی فراہمی صرف سوانح عمری کی تسوید کے تقاضے سے ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ مسلمان ان احوال پر اطلاع پا کر اپنی زندگیوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ چونکہ اتباعِ سنت کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک سنت کامل و مکمل طور پر محفوظ نہ ہو جاتی لہٰذا حضرت صلعم کے سوانح حیات کی ترتیب میں وہ اہتمام کیا گیا جو پوری تاریخ عالم میں بے مثال ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو

مخصوص ہے۔ ان کے حالات تو جذبات محبت کی تسکین، فقدانِ معیت و رفاقت کی تلافی اور اتباع سنت کے ساز و سامان کی فراہمی کی غرض سے جمع کیے گئے۔ لیکن عمومی حیثیت کے بڑے انسانوں کی سوانح عمریاں زیادہ تر حصول معلومات کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ بلا شبہ بعض شخصیتوں کے ساتھ بیشمار انسانوں کو کسی قدر روحانی وابستگی بھی ہوتی ہے لیکن عام طور پر گزرے ہوئے بڑے آدمیوں کے حالات محض دلچسپی اور معلومات کی غرض سے سنے جاتے ہیں۔ جب کوئی زیادہ عمر کا آدمی نوجوانوں کے کسی مجمع میں کسی ایسے بڑے آدمی کے حالات و عادات کی کہانی سناتا ہے جس کے ساتھ اس کی عمر کا کچھ حصہ گزرا ہے تو نوجوان نہایت ذوق و شوق سے اس کہانی کو سنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کہانی کے بعض مخصوص اور موثر حصے نوجوانوں کے دماغوں میں نہایت گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جس کا اثر ان کے اخلاق و احوال پر ضرور پڑتا ہے خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو۔

جب "بزمِ اقبال" نے مجھے حکم دیا کہ میں علامہ اقبال کے سوانح حیات مرتب کروں تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ جس شخص کی زندگی علی العموم گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں بسر ہوئی اور جو دنیا و مافیہا سے بے پروا آغاز سے انجام تک اپنے فکر ہی کی دُنیا میں سرگرداں رہا، اس کی زندگی کے واقعات ایک مقالے کی صورت میں مرتب ہو سکیں تو ہو سکیں، ایک پوری کتاب کا مواد کیوں کر مہیا ہو گا۔ لیکن چونکہ مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہ راست علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے اور علامہ کے احباب، اعزہ، مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی ہے اس لیے

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کما حقہ روشنی نہیں ڈالی گئی لیکن وہ پہلو یقیناً ایسے ہیں جو اہلِ عالم کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہنے چاہییں۔ چنانچہ میں نے کتاب لکھنے کی ہامی بھر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ میری کتاب علامہ اقبال کی محض سوانح عمری ہوگی ان کی شاعری ان کے فلسفے اور ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مزید لکھی جائیں گی لیکن سوانح حیات گزشتہ سترہ سال کے دوران میں کسی نے بھی مرتب نہیں کی۔ میں اپنی اہلیت و استطاعت کے مطابق اس کام کو انجام دیدوں گا فلسفے وغیرہ پر تبصرے کے لیے کوئی اور انتظام کر لیجیے۔ قارئین کرام کو یہ دیکھ کر وحشت نہ ہونی چاہیے کہ اقبال پر یہ کیسی کتاب ہے جس میں ان کے فکر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں بات یہ ہے کہ میرا دائرہ کار صرف سوانح نگاری تھا اور میں نے اسی دائرے کے اندر رہ کر یہ کتاب لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں ایک خوشخبری بھی عرض کر دوں کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جو ایک اعلیٰ درجے کے فلسفی اور نقادِ سخن ہونے کے علاوہ علامہ کے مدۃ العمر کے عقیدت مند احباب میں سے ہیں، علامہ کے شعر و فلسفہ پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں مجھے جن ذرائع و وسائل سے امداد ملی ان کا ذکر نہ کرنا پرلے درجے کی ناشکرگزاری ہوگی مولانا مہر اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے علامہ کے احباب اور ملنے والوں سے ملاقات کر کے جو معلومات فراہم کیں، ان سے میں نے بڑا کام لیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور جسٹس ایس اے رحمان نے نہایت قیمتی

مشورے دیے اور بعض بیانات کی ذمہ دارانہ تصحیح کی تکلیف گوارا فرمائی. میں ان حضرات کا تہِ دل سے ممنونِ احسان ہوں. کتابوں میں سے مجھے حیاتِ اقبال (تاج کمپنی)، مکاتیبِ اقبال (شیخ عطاء اللہ)، ملفوظاتِ اقبال (محمود نظامی)، اقبال کا سیاسی کارنامہ (محمد احمد)، روزگارِ فقیر (سید وحید الدین)، سیرتِ اقبال (طاہر فاروقی)، حرفِ اقبال، خطوطِ اقبال بنام جناح، خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی، اقبال کا مطالعہ (سید نذیر نیازی) اور بعض دوسری مطبوعات سے استفادہ کا موقع ملا. ان سب کا ذکر بطور اظہارِ امتنان ضروری سمجھتا ہوں.

ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے سوانحِ حیات کی ترتیب میں مجھ سے بے شمار فروگزاشتیں سرزد ہوئی ہوں اور بعض احبابِ کرام کو مزید معلومات بھی حاصل ہوں کیوں کہ کوئی ایک شخص کسی شخصیت کے پورے حالات کا احاطہ و استقصا نہیں کر سکتا. میں ان فروگزاشتوں کے لیے معافی کا طالب ہوں اور مستدعی ہوں کہ جن حضرات کو اس کتاب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس ہو وہ میری رہنمائی فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں مناسب اضافے اور ترمیمیں کر دی جائیں.

مسلم ٹاؤن لاہور

یکم جون ۱۹۵۵ء

عبد المجید سالک

پہلا باب

اقبالؒ کی تعلیم و تربیت

اقبال ۱۸۷۷ء

پہلی فصل

سیال کوٹ میں

پنجاب کا مشہور اور قدیم قصبہ سیال کوٹ جو ہمیشہ فضائے روزگار کی علمی جولانیوں کا مرکز رہا ہے، ہمارے دور میں ایک ایسے آفتاب عالم تاب کا مطلع بنا جس نے مشرق و مغرب کی پنہائیوں کو منور کر دیا، ترجمان حقیقت لسان اسلام حکیم الامۃ علامہ اقبال کا مولد و منشا ہونے کا فخر اسی مقام کو حاصل ہے۔

آبا و اجداد علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے شمع و چراغ تھے۔ جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیشتر سترہویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا، اس کا گوت سپرو تھا۔ یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہم چشموں میں معزز و ممتاز تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں سے سری نگر میں تشریف لائے۔ علامہ کے جد اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برہمن نے سید کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، صالح نام پایا۔ سید صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک سے اس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے۔ رجوع عام ہوا، مزار

کشمیر میں ہے لیکن مقام معلوم نہیں ہو سکا۔[1]

سن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد بابا صالح رح کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بیشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبال کی دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کا نام شیخ محمد رفیق تھا لیکن عام کشمیری رواج کے مطابق جس میں رحمانا اور رغفارا جیسے عرف مروج ہیں، شیخ رفیقا کہلاتے تھے، کشمیری دھسوں کی تجارت کرتے تھے۔ ان کے دو صاحب زادے ہوئے، ایک کا نام شیخ نور محمد (والد علامہ)، دوسرے شیخ غلام قادر جو نہر کے محکمہ میں ملازم تھے اور جن کا انتقال روپڑ (ضلع انبالہ) میں ہوا۔

خاندان

شیخ نور محمد کی شادی جس خاتون سے ہوئی ان کا نام امام بی بی تھا اگرچہ علم سے بہرہ نہ پایا تھا لیکن نہایت دانشمند اور اپنے محلے اور برادری میں بیحد محترم اور ہر دلعزیز تھیں خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چونکہ ابتدا ہی سے علما و صلحا کی صحبت میں رہے اور غور و فکر کی عادت کے علاوہ تصوف میں درخور وافی رکھتے تھے اس لیے بعض ہمعصر اکابر علم ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی ہیں۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں پڑھ کر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے شیخ صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے۔[2]

شیخ نور محمد نہایت وجیہ و شکیل بزرگ تھے، رنگ سرخ، داڑھی سفید، لباس سادہ

۱۔ روایت محمد نذیر صوفی

۲۔ روایت سید ذکی شاہ خلف مولانا میر حسن۔

بہت کم گو تھے، چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے، نظر ہر وقت سامنے رکھتے، ادھر ادھر نہ دیکھتے، نہایت متین، ذی عقل، سنجیدہ مزاج بزرگ تھے اور قصبہ میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے!

سیالکوٹ میں ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی مدتوں مقیم رہے، ان کے نام سے ایک محلہ بھی موسوم ہوا، انھوں نے ایک باغ لگایا جو ڈپٹی کے باغ کے نام سے مشہور رہا، رفاہ عام کے لیے ایک حوض بھی بنوایا۔ بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلا بھی ڈپٹی وزیر علی ہی نے جاری کیا تھا۔ شیخ نور محمد کو سب سے پہلے انھیں ڈپٹی صاحب نے اپنے ہاں پارچہ دوزی پر لازم رکھا تھا اور سنگر سینے کی مشین منگوا کر دی تھی جو اس زمانے میں نادر چیز تھی، معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ (والدۂ علامہ) ان کی تنخواہ میں سے ایک حبہ بھی نہیں لیتی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصہ شرعاً جائز نہ تھا، چنانچہ تھوڑی مدت کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے یہ ٹوپیاں اس قدر خوشنما اور مضبوط ہوتی تھیں کہ قلیل مدت کے اندر بجید مقبول عام ہو گئیں یہاں تک کہ شیخ صاحب کو متعدد خیاط لازم رکھنے پڑے۔ شیخ صاحب کے ضعیف ہو جانے پر یہ دکان ان کے داماد غلام محمد نے سنبھال لی لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی الگ ہو گئے اور دکان بند ہو گئی۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے ہوئے، بڑے صاحب زادے شیخ عطا محمد اور چھوٹے شیخ محمد اقبال (یعنی حضرت علامہ) ان کے علاوہ تین لڑکیاں

۱۔ روایت سید ذکی شاہ و مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی۔

بھی تھیں!

علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد نے معمولی سی تعلیم پائی، راٹھوروں کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی، سسرال والے فوجی پنشنر تھے انھوں نے کوشش کر کے شیخ عطا محمد کو رسالے میں بھرتی کرا دیا۔ کچھ مدت بعد شیخ عطا محمد ملازمت ترک کر کے رڑکی انجینرنگ اسکول میں داخل ہوگئے اور امتحان پاس کر کے ایم ای ایس میں اوورسیئر ہوگئے، کافی روپیہ کمایا، علامہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، یورپ بھیجا حضرت علامہ بھی اپنے بڑے بھائی کے بےحد مداح اور فریفتہ تھے۔ شیخ عطا محمد کے دو صاحبزادے ہیں: اعجاز احمد اور مختار احمد۔ شیخ اعجاز احمد حکومت پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ شیخ عطا محمد نے بیاسی سال کی عمر پائی، ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا، امام صاحب (امام علی الحق[۴]) کے قبرستان میں دفن کیے گئے! شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔

علامہ اقبال کے والدِ محترم تقریباً نوے سال کی عمر پاکر ۱۹۲۹ء میں واصل بحق ہوئے، والدہ محترمہ اس سے پندرہ سال قبل رحلت فرما چکی تھیں۔ دونوں کے مزار امام صاحب (سیالکوٹ) کے مقبرے کے پاس واقع ہیں۔

ولادت اور بچپن

(علامہ اقبال کی ولادت ۲ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی[۳] والد نے محمد اقبال نام تجویز کیا)

۱۔ سید ذکی شاہ خلف الرشید مولانا میر حسن کے بیان کے مطابق علامہ کی بہنوں کی تعداد ۲ اور منظور احمد صاحب ہمشیرزادہ علامہ کے قول کے مطابق ۳ ہے۔ ۲۔ روایت سید ذکی شاہ۔ ۳۔ تصدیق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ بہ حوالہ رجسٹر پیدائش و اموات۔

آپ کی ولادت سے قبل آپکے پاک نفس والدِ محترم نے جو خواب دیکھا وہ انھوں نے خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے یوں بیان کیا، میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت لوگ کھڑے ہیں، اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے، اس کی دلکشی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا اٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اترا اور میری گود میں آن گرا۔ آپنے اس کی تعبیر خود ہی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمتِ اسلام میں ناموری حاصل کرے گا۔

علامہ کا بچپن اسی طرح کا تھا جیسا غریب اور متوسط الحال شرفا کے بچوں کا ہوتا ہے لیکن رواياتِ متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ وہ ذہانت اور متانت میں دوسرے بچوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور طفلانہ آوارہ گردی سے طبعاً نفور تھے۔

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سیالکوٹ کے مراکز درس و تدریس چار تھے۔

۱۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب۔

۲۔ مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کی درس گاہ۔

۳۔ مولانا سید میر حسن۔

۴۔ مولوی مزمل۔

پہلی، دوسری اور چوتھی تین درس گاہوں میں صرف عربیات و دینیات

کی تدریس کا اہتمام ہوتا تھا اور مولانا میر حسن کے ہاں عربی و فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مولوی میر حسن شاہ

چونکہ علامہ اقبال رح کے والدِ محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں معارف دین کی سماعت کیلئے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لئے انھوں نے اقبال رح کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے، ایک دن اقبال رح کو وہاں دیکھ کر پوچھا: یہ کس کا بچہ ہے؟ جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ، اسے میں پڑھاؤں گا، چنانچہ اقبال رح مولانا سید میر حسن کے سپرد ہو گئے اور وہ تعلق پیدا ہوا جو مدۃ العمر قائم رہا![1]

اقبال رح کی بھاوج یعنی شیخ عطا محمد کی اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ اقبال رح بہت ہی چھوٹی عمر میں بھید ذہین تھے اور شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ازار بند بُنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے، ان کی آواز بہت شیریں تھی۔

اقبال رح کے والدین کا مکان جس بازار میں ہے اس کا نام پہلے صدر تھا پھر

۱۔ مولانا سید میر حسن کو علامہ اقبال رح کی تعلیم و تربیت میں جو مقام حاصل ہے اس کے تقاضے سے اس کتاب میں مولانا کے حالات کے متعلق ایک مستقل باب باندھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہاں مولانا کے صرف سرسری ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو باب ۶

اسے "دو دروازے والا بازار" کہنے لگے، آجکل اس کا نام "اقبال اسٹریٹ" ہے اس بازار ہی کے ایک کوچے میں مولانا سید میر حسن کا مکان ہے، اس کوچے کو کوچہ میر حسام الدین کہتے ہیں۔ میر حسام الدین مولانا میر حسن کے چچیرے بھائی تھے۔

بٹیریں پالنا بچپن میں اقبالؒ کو بٹیریں پالنا، کبوتر اڑانا اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے، آپ نے فرمایا: کم بخت اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے تو اقبالؒ نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے۔ لال پہلوان (لالو) جو اقبالؒ کے بچپن کے دوست ہیں، ان کی کبوتربازی کے قصے سناتے ہیں۔

تصوف کے متعلق علمی اعتبار سے اقبالؒ کے ذہن میں جو کشمکش پیدا ہوئی اس کا ذکر تو اپنے مقام پر آئیگا لیکن جہاں تک وجدان کا تعلق ہے، اقبالؒ لطائف وجدانی کو مانتے بھی تھے اور ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے والد نہایت پرہیزگار اور صوفی آدمی تھے اور بعض اوقات اپنے قوائے روحانی کے نشوونما کے لئے چلہ کشی کی ریاضت بھی کرچکے تھے۔ اقبالؒ نے اپنے والد کے متعلق بعض واقعات سنائے تھے، جن میں سے ایک واقع بعض کتابوں میں شائع بھی ہوچکا ہے۔ راقم الحروف نے بھی اقبال کی زبان سے یہی واقعہ ہو بہو سنا ہے اس لئے اس کو نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے بتایا کہ جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے

سے بیدار ہو گیا میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں فوراً بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو ادھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آرہی تھی۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور مجھے سمجھا بجھا کر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رویا سنا رہے تھے جو رات انھوں نے بہ حالتِ بیداری دیکھا تھا۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ہوا ہے۔ اس قافلہ میں ایک شخص بہت بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لئے فوراً پہنچنا چاہیئے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا، مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیئے۔ چند گھنٹوں میں تانگا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کارواں کا ڈیرہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے کے لئے پنجاب آئے ہیں۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار بحد متعجب ہوا کہ یہ شخص کون ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہے لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا

جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بیحد خراب ہے، اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی، وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی، اسوقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی لیکن چوبیس گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحتیاب ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔

جب باپ کی یہ کیفیت ہو، اس کے مرشدوں اور دوستوں کا حلقہ بھی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو اور دن رات اس قسم کے کرشمے چشم و گوش کی پرورش کرتے رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اقبالؒ کا ذہن وجدانی کیفیت کے لئے کسقدر آمادہ ہو گا۔ غالباً یہی وجہ ہو گی کہ اقبال نے اپنی علمی تحقیق کے لئے بھی مابعد الطبیعیات ہی کا موضوع تجویز کیا۔

سکاچ مشن اسکول میں

شیخ نور محمد نے مولانا میر حسن کے ارشاد پر اقبالؒ کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا۔ اقبال اس سے قبل بھی ابتدائی دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور سکول میں داخل ہونے کے بعد بھی مولانا سے برابر پڑھتے رہے۔ کبھی کبھی دینیات

کے درس کے لیے مولانا غلام حسن کے ہاں بھی چلے جایا کرتے تھے۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اقبالؒ نے غالباً ۱۸۸۷ء میں پرائمری، ۱۸۹۰ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں انٹرنس پاس کیا۔ تینوں امتحانوں میں انھوں نے وظیفہ حاصل کیا۔[1] سید ذکی شاہ کی روایت ہے کہ اقبالؒ نے انٹرنس کا امتحان ۱۸۹۳ء میں پاس کیا جب ان کی عمر بیس سال تھی۔ ہمارے نزدیک یہ روایت زیادہ صحیح ہے۔

پہلی شادی

ابھی انٹرنس کے امتحان کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ اقبالؒ زنجیر ازدواج میں جکڑ دیے گئے۔ گجرات میں ایک دولتمند بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان رہتے تھے۔ ان کی بڑی صاحبزادی سے رشتہ طے پایا۔ جب برات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لیے تیار ہوئی، سہرا بندھ گیا، اقبال گھوڑے پر سوار ہو گئے تو پاس ہونے کی خوشخبری کا تار آیا۔ اقبالؒ کی یہ پہلی شادی ناکام ہوئی، اگرچہ انھوں نے نباہ کی بیحد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے لیکن زوجین میں میل کا امکان کم ہوتا گیا اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ مریم کا انتقال علامہ کی والدہ محترمہ کی وفات سے بھی پہلے ہو گیا تھا۔ امام صاحب (سیالکوٹ) کے مقبرے کے پاس قبر ہے، وہیں علامہ کے والدین کی قبریں بھی ہیں۔

سکول اور کالج کے اساتذہ

چونکہ اس وقت تک سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں کھل گئی تھیں اور اسکا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا تھا اس لیے اقبالؒ نے انٹرنس پاس کرنے کے

۱۔ بیانات خواجہ فیروزالدین احمد بیرسٹر و علی بخش۔

بعد ایف اے کی تعلیم بھی وہیں جاری رکھی۔ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس وقت حسب ذیل اساتذہ اس سکول اور کالج میں پڑھاتے تھے:

۱۔ ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد)، ۲۔ ماسٹر پالا مل، ۳۔ منشی امام الدین، ۴۔ مولانا سید میر حسن، ۵۔ مسٹر ڈبوڈ ہیڈ ماسٹر، ۶۔ ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی)، ۷۔ مسٹر وی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہو گئے)، ۸۔ پادری ینگسن (سکاچ مشن)، ۹۔ جارج واخ پرنسپل سکاچ مشن کالج۔

اس زمانے میں اقبالؒ شعر گوئی کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے۔ خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سکول کے جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی۔

مرزا داغ سے تلمذ

اس کے علاوہ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ اقبالؒ کی طالب علمی کے زمانے میں سیالکوٹ میں بھی ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ اس زمانے میں اقبالؒ نے خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی اور اس طرح اقبالؒ کو اردو زبان دانی کے لیے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا ...... جنابِ داغ نے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ تلمذ کا سلسلہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبالؒ کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور

اقبالؔ نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔!"

مولانا میر حسن کے فیضِ تربیت سے اقبالؒ برابر بہرہ اندوز ہوتے رہے اور فاضل و شفیق استاد نے اس جوہرِ قابل کو علم و حکمت، شعر و ادب، فارسی و عربی زبان دانی اور فکرِ صحیح کے محاسن سے مالا مال کر دیا۔ علامہ اقبالؒ بھی مولانا کے عز و احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے اور ۱۹۲۹ء تک جب مولانا کا انتقال ہو گیا، ہمیشہ جب کبھی سیالکوٹ جاتے اس آستانۂ علم پر جبہ سائی سے ہرگز غفلت نہ کرتے۔

سکاچ مشن کالج سے ایف اے پاس کرنے کے بعد اقبالؒ لاہور بھیج دیئے گئے تاکہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کر سکیں کیونکہ سکاچ مشن کالج میں ابھی بی اے کی کلاسیں نہیں کھلی تھیں اور وہ مرے کالج کے نام سے موسوم نہ ہوا تھا۔

۱۔ شیخ سر عبدالقادر۔ دیباچہ بانگِ درا۔

دوسری فصل

اقبالؒ لاہور میں

ٹامس آرنلڈ

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے، گورنمنٹ کالج کی بی اے کلاس میں داخل ہوئے اور انگریزی فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا، وظیفہ بھی پایا اور عربی اور انگریزی میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ سے قطع تعلق کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ ایک تو اقبالؒ کا اپنا رجحان فلسفے کی طرف تھا، اس پر آرنلڈ جیسے نامور فلسفی کی شاگردی کا موقع ملا چنانچہ اقبال نے فلسفے کے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر آرنلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ اپنے احباب کر اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم اے پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے، اس لیے ایک طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔

کواڈرینگل کمرہ نمبر ۱

اقبال لاہور کے زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج

کے اس ہوسٹل کے کمرہ نمبرا میں مقیم رہے جو "کواڈرینگل" کہلاتا ہے۔ ان کا کمرہ دوستوں کے جمگھٹوں اور شعر خوانیوں کا مرکز بنا رہتا تھا اور جو نیر طلبہ جنھیں اس محفل میں بار نہ ملتا تھا بڑی حسرت سے اس کمرہ کی رونقوں کو دور سے دیکھتے تھے۔ اقبال عام طور پر لاہور کے مشاعروں میں نہ جاتے تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ہم جماعت انھیں کھینچ کر ایک مشاعرے میں لے گئے جس میں شہزادہ مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔ اقبالؒ نے جب اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مشاعرے میں غزل

تو مرزا ارشد اچھل پڑے اور کہنے لگے: اقبال! اس عمر میں یہ شعر؟ ایک دو دفعہ اور بھی اقبالؒ نے اس مشاعرہ میں غزلیں پڑھیں تو لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ شیخ عبدالقادر کے ساتھ اسی زمانہ میں دوستی کے تعلقات قائم ہوئے۔ منشی محمد دین فوق بھی داغ کے شاگرد تھے اور کشمیری قوم کی خدمت میں بھی سرگرم رہتے تھے اس لیے اقبال سے ان کو خصوصی اخلاص تھا، چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کی پہلی مجلس میں اقبال نے فوق صاحب کی تحریک پر پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا: "کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزون ا"، اور مقطع تھا:

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

ا۔ کشمیری میگزین لاہور جلد ۴ نمبر ۳

اس وقت اقبالؒ نے ابھی بی اے بھی پاس نہ کیا تھا۔

نالۂ یتیم ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا جو سالانہ جلسہ ہوا اس میں اقبالؒ نے ایک نظم "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ترنم کے ساتھ پڑھی۔ نظم بجید مؤثر تھی اور ترنم اس سے بھی زیادہ مؤثر تھا، چنانچہ اس پر ہزاروں حاضرین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی۔ بہت سی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف سے اقبال کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں لیکن انھوں نے ہمیشہ ان فرمائشوں کی تعمیل سے انکار کیا۔

سرسیّد کے انتقال کی تاریخ قیامِ لاہور کے زمانے میں ایک دفعہ اقبالؒ تعطیلات کی وجہ سے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے کہ سرسیّد احمد خاں کے انتقال کی خبر آئی۔ مولانا میر حسن سے سرسیّد کے تعلقات بہت گہرے تھے، انھیں بجید صدمہ ہوا۔ وہ کالج جا رہے تھے، راستے میں اقبالؒ مل گئے۔ آپ نے فرمایا "سرسیّد فوت ہو گئے ہیں، ذرا تاریخِ وفات کی فکر کرنا" اقبالؒ ایک شناسا کی دوکان پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد سیّد ذکی شاہ سے کہنے لگے "تاریخِ وفات ہو گئی ہے جاؤ ابھی شاہ صاحب کو سنا دو"۔ تاریخ تھی: انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک۔ ذکی شاہ نے یہ تاریخ شاہ صاحب (مولانا میر حسن) کو جا کر سنائی تو انھوں نے فرمایا "بہت خوب ہے۔ میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے۔ غفرلہٗ"[۱]

مولانا حالی نے جب سرسیّد کی سوانح عمری "حیاتِ جاوید" لکھی تو اس

۱۔ بیان سیّد ذکی شاہ

میں ان دونوں تاریخوں کا ذکر تھا لیکن نام کسی کا بھی درج نہ تھا۔ مولانا میر حسن نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا کہ بہت افسوس کی بات ہے ان تاریخوں پر آپنے کسی کا نام نہ لکھا، یہ دونوں تاریخیں شاگرد اور استاد کی ہیں۔ خواجہ حالی نے معذرت کا خط لکھا اور کہا کہ مجھے ناموں کا علم نہ ہو سکا، اب انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں نام ضرور لکھدوں گا۔

مکلوڈ عربک ریڈر ایم اے پاس کرنے کے بعد اقبالؒ اورینٹل کالج لاہور میں "مکلوڈ عربک ریڈر" مقرر ہوئے اور کچھ مدت بعد انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی جس پر وہ ۱۹۰۵ء تک فائز رہے۔ اس زمانے میں اقبالؒ نے بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے بازار میں ایک بالاخانہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کے نیچے آجکل ایک کمہار کی دوکان ہے، مکان نمبر ۱۱ ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۱ء میں بھی اقبالؒ نے ایک دلگداز نظم پڑھی جس کا عنوان تھا۔ "ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے" یہ نظم وہ تھی جس کا آخری شعر یہ تھا:

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

۱۹۰۱ء ہی میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا، اقبال اس وقت سیالکوٹ میں تھے۔ ۹ر فروری ۱۹۰۱ء کے پیسہ اخبار میں سیالکوٹ کے ایک ماتمی جلسے کی کارروائی درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماتمی قرارداد کی تائید میں

شیخ محمد اقبالؒ ایم اے نے بھی تقریر کی، اس جلسے کی صدر مولوی نیاز علے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے۔

مخزن میں "ہمالہ"

۱۹۰۱ء کے ماہِ اپریل میں شیخ عبدالقادر کا مشہور ادبی رسالہ 'مخزن' جاری ہوا، لاہور کی ایک ادبی مجلس میں جو بعض معزز مشاہیر نے قائم کی تھی اقبالؒ نے اپنی ایک نظم "ہمالہ" پڑھ کر سنائی جو (بانگِ درا کی پہلی نظم ہے) یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور ہر طرف سے فرمائش ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے لیکن اقبالؒ کا خیال تھا کہ اس نظم میں ابھی بعض خامیاں باقی ہیں اس لئے نظرِ ثانی کے بعد اسے شائع کرنا مناسب ہوگا لیکن شیخ عبدالقادر نے ان سے وہ نظم حاصل کر کے 'مخزن' کے پہلے پرچے میں شائع کر دی۔

فکرِ سخن کا اندازہ

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک جب اقبالؒ ولایت گئے، ان کی نظموں کا سلسلہ جاری رہا اس عرصہ میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے اور جوں جوں لوگوں کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا، جا بجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائشیں آنے لگیں اور انجمنیں اور مجلسیں درخواست کرنے لگیں کہ ان کے سالانہ جلسوں میں لوگوں کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ شیخ صاحب (اقبالؒ) اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہوگئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی، شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی

آمد ہوتی تھی، ایک ایک نشست میں بیشمار شعر ہوتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا، موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلے، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے، اور درمیان میں خود وہ انھیں قلم بند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعرا کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے مگر یہ رنگ کسی اور کا نہیں دیکھا۔ اقبالؒ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ باایں ہمہ موزونی طبع وہ حسبِ فرمائش شعر کہنے سے قاصر رہے ہیں۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے، یہ قریب قریب ناممکن ہے!"

اس طویل اقتباس کا یہ مقصد ہے کہ اقبالؒ کے اندازِ شعر گوئی کے متعلق صحیح کیفیت معلوم ہو جائے۔ شیخ عبد القادر چونکہ خود بھی ادبیاتِ اردو کے نقد و نظر میں پایہ بلند رکھتے تھے اور اقبال سے ان کا تعلق بھی مدۃ العمر دوستانہ

۱۔ دیباچہ بانگِ درا

مخلصانہ رہا اس لئے ان کے مشاہدات کو معتبر و مستند تسلیم کرنا چاہیے۔

علی بخش اور علامہ

(جس زمانے میں اقبال گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے) انھیں دنوں مولوی حاکم علی (جو بعد میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے) مشن کالج میں پڑھاتے تھے۔ علی بخش (ملازم اقبال ۴) لاہور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس تلاشِ ملازمت کے لئے آیا اور چند روز کے بعد اسے مولوی حاکم علی کے ہاں ملازمت مل گئی۔ ابھی اس ملازمت پر چار ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن مولوی صاحب نے ایک خط علی بخش کے ہاتھ اقبال کو بھیجا۔ خدا جانے اقبال کو علی بخش کی کون سی ادا بھا گئی۔ انھوں نے اس سے کہا کہ تم ہماری نوکری کرو۔ علی بخش نے کہا میں تو مولوی صاحب کے پاس ہوں، انھیں کیوں چھوڑوں؟ اقبال نے کہا "علی بخش! ہمارے پاس آجاؤ گے تو بہت اچھے رہو گے"۔ ان کے اصرار پر علی بخش نے وطن سے اپنے بھائی کو بلوا کر مولوی حاکم علی کے پاس رکھوا دیا اور خود اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

علی بخش کا بیان ہے کہ اقبال کچھ مدت بعد ولایت چلے گئے اور مجھے اپنے بھائی کے پاس ہنگو (کوہاٹ) بھیج دیا۔ وہاں میرا دل نہ لگا، واپس آگیا۔ پہلے اسلامیہ کالج میں پھر مشن کالج میں نوکر ہو گیا۔ ایک دن سید تقی شاہ (ابنِ مولانا میر حسن) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا: علی بخش! میں تیری تلاش میں تھا، ولایت سے شیخ صاحب (اقبال) کا خط آیا ہے کہ علی بخش کو تلاش کرو۔ وہ نوکر ہو یا بیکار، میرا انتظار کرے۔ میں نے کہا کہ میں اب ملازم ہوں۔ وہ کہنے لگے "شیخ صاحب کا تاکیدی خط آیا ہے، جو وہ چاہتے ہیں وہی کرو"۔ ڈاکٹر صاحب ولایت

سے آتے تو میں نوکری چھوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔ میری شادی ہو چکی تھی لیکن میری بیوی میرے لاہور آنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی۔ گھر والوں نے دو تین دفعہ میری شادی کا انتظام کیا۔ میں شیخ صاحب (اقبال) سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ میں نے جب کبھی ان سے پوچھا انھوں نے یہی جواب دیا کہ پہلے کھانے پینے کا انتظام کریں پھر شادی کرنا مناسب ہوگا۔ غرض دوبارہ شادی کی نوبت ہی نہ آئی۔[۱]

یہ تھی علی بخش سے اس تعلق کی ابتدا جو تادم مرگ قائم رہا بلکہ علی بخش حضرت علامہ کے انتقال کے بعد بھی ان کے بچوں کی خدمت میں منہمک رہا۔ آجکل کے زمانے میں ایسے ملازم بالکل ناپید ہیں، جو ایک آقا سے عمر بھر نباہ کریں اور ایسے آقا بھی کہاں ہیں۔؟

ای۔ اے۔ سی کا امتحان

۱۹۰۱ء کا ذکر ہے، اقبالؒ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان کے مقابلہ میں شامل ہوئے لیکن طبی بورڈ نے طبی نقطۂ نگاہ سے ان کو "ان فٹ" قرار دیا۔ حالانکہ بظاہر ان کی صحت بہت اچھی تھی سرخ و سفید تھے اور اکھاڑے میں ڈنڈ پیلا اور رگڑ رہا یا کرتے تھے۔ اس بے انصافی کے خلاف پیسہ اخبار کشمیری گزٹ نے احتجاجی نوٹ لکھے![۲]

شیخ عطا محمد پر مقدمہ

۱۹۰۳ء میں اقبالؒ کو ایک شدید پریشانی سے سابقہ پڑا۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اس زمانے میں بلوچستان کی سدریر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے۔ بعض مخالفین نے سازش کر کے ان کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ کھڑا کر دیا جس میں عزت

۱۔ بیان علی بخش ۲۔ کشمیری گزٹ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۱ء

کے علاوہ جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ اقبال کو اس سلسلے میں قورٹ سنڈیمن جانا پڑا، آخر بڑی جدوجہد اور لارڈ کرزن وائسرائے سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا۔ خاندان بھر نے بےحد پریشانی اٹھائی، زرِ کثیر صرف ہوا لیکن شیخ عطا محمد باعزت بری ہوئے اور ملازمت پر بھی آنچ نہ آئی حالانکہ بلوچستان ایجنسی کے کارفرما شیخ صاحب کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے تھے![1]

انجمن حمایت اسلام میں

اس زمانے میں قریب قریب ہر سال اقبال انجمن حمایت اسلام کے جلسے کے لیے نظم لکھتے تھے چنانچہ "فریادِ اُمت بہ حضور سرورِ کائنات" اور "تصویرِ درد" اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ "تصویرِ درد"[2] تو بانگِ درا میں موجود ہے لیکن "فریادِ امت" جو خاصی طویل ترکیب بند تھی، بانگِ درا کی ترتیب کے وقت قلم زد کر دی گئی اور اس کا صرف ایک بند "دل"[3] بانگِ درا میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے جلسے میں خواجہ الطاف حسین حالی تشریف لائے، مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔

خواجہ حالی اور مرزا ارشد

خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی نظم ساتھ نہیں لا سکا، اس پر مرزا ارشد نے مزاحاً ایک دو رباعیاں کہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالی آئے ۔۔۔ سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہی کیا خوف سے کیا گھبراہٹ ۔۔۔ بھول آئے ہیں نظم گھر سے خالی آئے

خواجہ حالی نے فرمایا کہ میں کل نظم پیش کروں گا۔ دوسرے دن نظم کہہ کر

۱۔ اقبال نامہ عطا اللہ حصہ اوّل صفحہ ۵ و ۶ ۲۔ بانگِ درا صفحہ ۶۲ ۳۔ بانگِ درا صفحہ ۵۴

لائے۔ جب سنانے لگے تو معلوم ہوا کہ ان کی کشش کی وجہ سے مجمع بہت زیادہ ہو رہا ہے اور ان کی آواز سب حاضرین تک نہ پہنچ سکے گی۔ خواجہ صاحب نے چند ہی شعر پڑھے تھے کہ مجمع نے تقاضا کیا کہ یہ نظم اقبال سے پڑھوایئے۔ چنانچہ خواجہ حالی کی نظم اقبال کو پڑھنے کے لیے دی گئی۔ اقبال نے نظم پڑھنے سے پہلے ایک فی البدیہہ اور برجستہ رباعی پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی　　معمورِ مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا　　جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

اس کے بعد آپ نے خواجہ صاحب کی نظم نہایت پُرتاثیر لے میں پڑھ کر سنائی۔ خواجہ صاحب کی اس نظم کے چھ بند تھے، یہ نظم "جواہراتِ حالی" کے صفحہ ۵۴ پر چھپی ہوئی ہے۱۔

دلچسپ قطعہ اسی سال اقبالؒ نے انجمن کے جلسے میں ایک طویل قطعہ پڑھا تھا جس کے ابتدائی اشعار یہ تھے:

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں
شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وہاں
ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے
وعظ کہتے تھے نہ مسلم کوئی انگریزی پڑھے
کفر ہے آغاز اس بولی کا کفر انجام ہے۲

۱۔ بیان خواجہ فیروزالدین احمد　۲۔ روداد جلسہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۰۴ء

اس قطعہ میں دوسرے مزے مزے کے اشارات کے علاوہ اپنے دوست
زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی پر بھی ایک چوٹ کی گئی تھی :

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں
ان سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

چونکہ اس قطعہ میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی گئی تھیں اس
لیے مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے قطعہ کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس
کے متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا :

آجکل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یونہیں بدنام ہے

غرض یہ قطعہ بیحد دلچسپ تھا اور سننے والوں نے شاعر کے اشارات سمجھ کر اس
سے خوب لطف اٹھایا۔

بازارِ حکیماں کی مجلسیں

بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر بازارِ حکیماں علامہ اقبال
کے رجوع کا مرکز رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ
تھی کہ جب علامہ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں پروفیسر
ہو گئے تو انھوں نے ہوسٹل سے نکل کر سب سے پہلے بھاٹی دروازے کے اندر ہی
محلہ جلوٹیاں کے سامنے ہی سکونت اختیار کی۔ علاوہ بریں شیخ گلاب دین وکیل
سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور کشمیریت کے علاوہ اقبال کو ان سے ہم وطنی
کا تعلق بھی تھا۔ ان کے ساتھ ہی مولوی احمد دین، سید محمد شاہ، خواجہ رحیم بخش (خواجہ
فیروز الدین احمد بیرسٹر کے والد) خلیفہ نظام الدین (ڈاکٹر مظفر الدین مرحوم سابق

ڈائرکٹر انڈسٹریز پنجاب کے والد) سے روابط روزافزوں ہوئے پہلے پہل احباب خوش ذوق کا یہ مجمع حکیم شہباز الدین کے مکان پر ہوا کرتا تھا، پھر جب حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا تو یہ مجمع اس چبوترے پر ہوتا تھا جو حکیم الدین بیرسٹر کے مکان کی سامنے واقع تھا۔ راقم الحروف نے بھی متعدد بار علامہ اور مولوی احمد دین سے اس چبوترے پر ملاقات کی ہے۔

بعد کے مراحل پر چودھری شہاب الدین، شیخ عبدالقادر اور میاں فضل حسین بھی اس مجلس میں شامل ہونے لگے تھے اور کبھی کبھی فقیر سید نجم الدین (کرنل فقیر وحید الدین کے والد) بھی کارِ سرکار سے رخصت ملنے پر چند گھنٹے ان احباب کی صحبت میں بسر کر جاتے۔ جب اس مجمع میں علامہ اقبال کے ساتھ ہی چودھری صاحب، شیخ صاحب اور میاں صاحب زیادہ نمایاں ہو گئے تو لوگ اس کو "ہاؤس آف لارڈز" کہا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ چاروں حضرات یکے بعد دیگرے سر ہو گئے یعنی علم و ادب کے علاوہ یہ مجلسیں اس زمانے کے معیار کے مطابق معاشرتی وجاہت کا سرچشمہ بھی تھیں اس لیے ان کے شرکا سب کے سب شرفائے خاندان تھے جو حکام اور عوام دونوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ابتدائی مشاعرے جن میں اقبال نے غزلیں پڑھیں اور اہلِ لاہور سے روشناس ہوئے، یہیں منعقد ہوتے تھے اور حکیم شہاب الدین ہی ان کا انتظام و انصرام کرتے تھے!

۱۔ بعض بزرگوں نے بتایا کہ اس مشاعرے کی غزلیں ایک رسالہ میں چھاپ دی جاتی تھیں جس کا نام "شورشِ محشر" تھا اور جس کے ایڈیٹر خان احمد حسن خان تھے تلاش کے باوجود اس رسالے کے پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔

خان احمد حسین خاں فرماتے ہیں کہ وہ خود ان مجالس میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں سامعین کی تعداد کم و بیش ایک سو ہوتی تھی۔ اس کے بعد یہ مشاعرے زیادہ وسیع ہو گئے اور نواب غلام محبوب سبحانی (خلف شیخ امام الدین گورنر کشمیر) کی صدارت میں اس مقام پر منعقد ہونے لگے جہاں آجکل انارکلی بازار کے آغاز میں ہوٹل واقع ہے۔ ان مجلسوں کی تنظیم و تربیت کیلئے ایک ادبی انجمن بھی قائم ہو گئی تھی جس کے صدر مسٹر مدن گوپال بیرسٹر اور سیکرٹری خان احمد حسین خاں تھے اور لالہ ہرکشن لال، میاں شاہ دین اور دوسرے نامور لوگ بھی ممبر بن گئے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ہمالہ اسی انجمن کے ایک اجلاس میں پڑھ کر سنائی تھی۔ ان مجالس کا مدعا یہ تھا کہ غزل کے علاوہ نظم کو بھی رواج دیا جائے چنانچہ میاں شاہ دین کی تجویز پر سب سے پہلے مناظرِ فطرت پر نظمیں لکھنے کا فیصلہ ہوا پہلا عنوان ہمالہ تجویز کیا گیا جس پر اقبال، احمد حسین خاں اور بعض دوسرے صاحبوں نے نظمیں لکھیں۔

خان صاحب کا بیان ہے کہ میں یہ تو اس وقت کہہ نہیں سکتا کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تھی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اقبال جو کچھ بھی پڑھتے تھے، اس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دیتے تھے، شعر بھی اچھے ہوتے تھے اور آواز میں بھی خاص سوز اور اثر تھا۔ اس سے پیشتر مشاعروں یا جلسوں میں نظمیں گا کر پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ اقبال نے اس معاملہ میں اولیت حاصل کی۔ اس کے بعد یہ ترنم بالکل متعدی ہو گیا اور شعراء اکثر گا کر کلام سنانے لگے یہاں تک کہ عبدالمجید وکیل (لاہور) اور چودھری خوشی محمد ناظر (کشمیر) بھی آواز واجبی ہونے کے باوجود

گا کر پڑھتے تھے۔

اقبالؒ کی مہارتِ فن

علامہ اقبال عام طور پر عروض و زبان کی بحثوں سے بہت گھبراتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے محاورات اور قواعدِ فن کا زیادہ علم نہیں لیکن حقیقت میں یہ محض ان کا انکسار تھا یا وہ ان مبتدیانہ و طالب علمانہ بحثوں کی سطح سے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ نفسِ مضمون کے بجائے ان زوائد میں اپنا وقت صرف کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ بعض "اہلِ زبان" ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے یا "اودھ پنچ" اپنے مخصوص انداز میں ان کی فارسی ترکیبوں یا جدید اسالیب بیان کا مضحکہ اڑاتا تو وہ ٹس سے مس بھی نہ ہوتے بلکہ اپنے نیاز مندوں کو بھی اس قسم کی تنقیدوں کا جواب دینے سے منع فرما دیتے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ کیفیت نہ تھی۔ ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے کسی صاحب نے کسی اخبار میں "تنقید ہمدرد" کے نام سے اقبال اور ناظر[1] کے بعض اشعار پر زبان و فن کی بنا پر چند اعتراضات کیے۔ اس پر اقبال نے "اردو زبان پنجاب میں" کے عنوان سے ایک نہایت معقول اور دندان شکن جوابی مضمون لکھا جو "مخزن" میں شائع ہوا[2]۔ چند ابتدائی کلمات کے بعد اقبالؒ نے ایک نہایت کام کی بات کہی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ہمارے دوست "تنقید ہمدرد" اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان

۱۔ چودھری خوشی محمد ناظر ۲۔ ملاحظہ ہو "مخزن" بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء

بہ ہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطلب پر قادر ہو۔ اس کے محاورات والفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بہ خود قائم ہو جاتی ہے لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں۔ اس کے محاورات وغیرہ کی صحت اور عدم صحت کی معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اردو زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کر دیں لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کرے

تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو، اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصوص ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی زبان کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے تو آپ کا عذر بیجا ہو گا۔ اردو ہی ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش، بازار، لوٹ، چالان وغیرہ لے لئے ہیں اور ابھی روز بہ روز لے رہی ہے۔

یہ وہ معقول اور ناقابلِ تردید خیالات ہیں جو اقبال نے آج سے نصف صدی پیشتر ظاہر کئے تھے اور ان کی صداقت ہمارے آجکل کے ماحول میں اور بھی زیادہ روشن نظر آتی ہے۔ جو لوگ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی اردو کے محاورات کو صرف دہلی و لکھنو کے پرانے محاورات تک محدود رکھنے میں کوشاں ہیں اور پنجابی یا سرحدی یا سندھی یا بنگالی کے کسی محاورے کو اردو میں دخیل ہونے کا حق نہیں دینا چاہتے، انہیں اقبال کے منقولہ بالا خیالات پر غور کرنا چاہیئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "تنقید ہمدرد" کے معترضانہ مضمون کا لہجہ دعوئے ہمدردی کے باوجود تلخ اور دل آزار تھا کیوں کہ اقبال نے اپنے مضمون میں یہ کلمات بھی لکھے ہیں:

اگرچہ "تنقید ہمدرد" صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت

اور بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کیے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے اعراض کروں گا کیونکہ فنِ تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو۔ تنقید کی بنا دوستی، محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہیے نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں ازراہِ دوستی لکھیں اور طرزِ بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔

میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں:

مے مخور چنداں کہ نشناسد زگل گلچیں ترا
پاسبان حسن پاک خویشتن بودن خوش است

اس کے بعد اقبالؒ نے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بعض باتوں کا جواب اس سے پہلے انبالوی صاحب[1] ''دے چکے تھے، جن کا ذکر اقبالؒ نے کیا ہے اور ان جوابات کو شافی قرار دیا ہے۔ آگے چل کر اقبالؒ صرف ان اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو ان کے اشعار پر کیے گئے تھے مثلاً اقبال کا ایک شعر تھا:

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے
اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

''تنقید ہمدرد'' نے لکھا تھا کہ ''آرزو یاس سے یہ کہتی ہے'' ہونا چاہیے ''کو'' یہاں درست

۱۔ انبالوی صاحب سے غالباً میر نیرنگ مراد ہیں جو انبالہ کے باشندے اور اقبال کے مخلص دوست تھے۔ اقبال نے میر نیرنگ کا نام شاید اس وجہ سے نہ لکھا ہو کہ میر صاحب نے یہ جواب اپنے نام سے نہ دیا ہوگا بلکہ محض ''انبالوی'' ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہوگا۔

نہیں۔ اس پر اقبال لکھتے ہیں کہ

اکابر شعرار قدیم وحال کا کلام اس دعوے کا مویدہے کہ "کہنا" کا صلہ "کو" بھی آتا ہے اور "سے" بھی البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں کہنے کا مقولہ ایک کلمہ مفرد یا مرکب ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ہو اور اس میں مفعول اول کی کوئی صفت پائی جائے تو ہمیشہ "کو" آئیگا مثلاً "زید نے عمر کو جاہل کہا" "یا جمِ جام جہاں بیں کے پیمانے کو کیا کہیے" مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ فرد بھی ہو لیکن وہ مفعول اول کی صفت پر دال نہ ہو اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنی مرکب تام ہو، وہاں "کہنا" کا صلہ "کو" اور "سے" دونوں طرح آتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں "کہنا" کا مقولہ مرکب تام یعنی "اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں" ہے۔ آپ کا ادعا ہے کہ یہاں "کو" کی جگہ "سے" ہونا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ "سے" اور "کو" دونوں ہو سکتے ہیں اور اساتذہ کا کلام میرا موید ہے۔ فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں:

مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آکے عیسیٰ سر بالیں نہ کہیں "قم" مجھ کو

اس شعر میں "کہنا" کا مقولہ ایک مرکب تام یعنی "قم" ہے اور حضرت مرحوم اس کا صلہ "کو" استعمال کرتے ہیں مومن فرماتے ہیں:

دیا اس بدگمان کو طعنۂ غیر
غضب ہو، کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں فرماتے ہیں:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی ہی نہیں دشت میں آواروں کو

اور لیجئے! مرزا رفیع سودا دولت مند بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں:

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے — کہ گیا کان میں یہ مہمان سے
چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو — کہ دو بلوا کے تم بکاول کو

مرزا نے پہلے شعر میں کہنے کا صلہ "سے" استعمال کیا ہے اور دوسرے میں "کو"، اب فرمایئے، آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں؟ اقبال کا ایک اور شعر تھا:

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں
اور کہیں لے کہاں کہیں

اس پر بھی معترض نے وہی اعتراض کیا کہ "تجھے" کی جگہ "تجھ سے" ہونا چاہیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبالؒ نے میر تقی، مرزا سودا، مومن، ظفر، داغ اور امیر کے اشعار پیش کئے ہیں جن میں ایسے موقع پر مجھے، تجھے، انہیں بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ اقبال کا ایک مصرع تھا؎

"جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں"

معترض نے لکھا کہ اس موقع پر "ہوا آنا" صحیح نہیں، اقبال نے جواب دیا:

"ہوا آنا" اردو محاورہ نہ ہوگا، میرا مقصود بھی تو محاورہ نہیں ہے خان آرزو مرحوم نے بھی اسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر کیا تھا مگر مولانا صہبائی مرحوم اس اعتراض

کے جواب میں فرماتے ہیں: "ایراد الفاظ گاہے بطریق محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم را باہم در ادائے مدعا بے تکلف اتفاق افتد و گاہے برائے تناسب و رعایت محسنات بدیعی الخ" میرے شعر میں پھولوں کو جو تعلق ہوا اور باغ سے ہے، وہ ظاہر ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کئے گئے۔ ہاں اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ہو کہ 'آنا' ہوا کے ساتھ اردو میں مسموع نہیں ہے تو ظفر دہلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہو گیا ہے پیرہن ٹھنڈا

اقبال کا ایک شعر تھا:

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

"تنقید ہمدرد" نے اعتراض کیا کہ بناؤں اور دیکھوں کا قافیہ غلط ہے اس پر اقبال نے لکھا ہے کہ بلاشبہ اس شعر میں ایطائے خفی ہے جس کو شایگاں کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعد قافیہ کی رو سے یہ قافیہ غلط ہے مگر اساتذہ نے اکثر فن قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ اس کے بعد اقبال نے یہ اشعار بطور سند پیش کئے ہیں:

پھر دل میں مرے لگی ہے آتش
نالے سے برس رہی ہے آتش (مومن)

جب وادیٔ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولہ پے تعظیم اٹھا ہے (ناسخ)
سنگدل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک
میری سوزش کیلئے غیر سے سازش کب تک (امیر)

اس کے بعد اقبالؒ نے شعراء فارسی کے کلام سے بیشمار مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ قواعد قافیہ کی خلاف ورزی عام ہے مثلاً

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی
خداوند امر و خداوند نہی (فردوسی)

چناں نادر افتاد در روضہ
کہ در لاجوردی طبق بیضہ (سعدی)

اسی طرح اردو اور فارسی کے بیشمار اشعار نقل کر کے اصول قافیہ پر بحث کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اس قسم کی خفیف سی خلاف ورزیاں قابل اعتراض نہیں ہیں کیونکہ اکثر شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اقبال "مفلسی" کے عنوان سے دو چار اشعار "مخزن" میں لکھے تھے، ان میں سے دو یہ ہیں:

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا
شور آواز چاک پیراہن لب اظہار مدعا ہے ترا

معترض نے اعتراض کیا کہ "صفا" بمعنی صاف لکھنا صحیح نہیں ہو۔ اس پر اقبال لکھتے ہیں:

اہل زبان کے تصرفات میں سے ایک یہ ہے کہ بسا اوقات

مصدر کو بمعنی اسم فاعل استعمال کرتے ہیں جس طرح اردو والوں نے 'صفا' مصدر کو صاف کے معنوں میں استعمال کیا ہے جکیم افضل الدین خاقانی خلیفۂ بغداد کی تعریف میں فرماتے ہیں: ابر انفاسش زوالِ قحط قحطاں آمدہ. علیٰ ہذا کبھی حال کو اسم فاعل کے معنوں میں بولتے ہیں. کلام ہو تو حضرت داغ دام فیضہ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمایئے:

آئینہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ ہے یہ، صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

دہلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ کرو تو میر انیس علیہ الرحمۃ کا یہ مصرع حاضر ہے

بت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

البتہ ظفر کا یہ شعر قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہاں صفا بمعنی صاف بہ ترکیب فارسی باندھا ہے اور فارسی میں صفا بہ معنی صاف مستعمل نہیں ہے.

وہ آئینہ ہے نہ جس کو ہو حاجت سیماب
اک اضطراب ہے کافی دلِ صفا کے لیے

دوسرے شعر پر "تنقید ہمدرد" نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ شورِ لب کیوں کر بن گیا اس پر جو اقبال نے بحث کی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے:

اس شعر میں ایک نازک بات تھی مگر افسوس آپ نے تدبر نہ کیا اور یہ اعتراض کر دیا کہ شورِ لب کیوں کر بن گیا. بنا خانۂ خیال کا

تماشائی ہو کر ایسی جنبش مژگاں سے رنگ تماشا کو توڑنا[۱] مناسب نہ تھا۔ اقبال ہمیدان عرض کرتا ہے کہ لب اظہار میں اضافت بیانی ہے۔ آپ کا اعتراض صحیح ہوتا اگر لب اظہار حقیقت لب ہوتا۔ ہاں اضافت بیانی کی اگر سند چاہو تو حاضر ہے:

صف مژگاں تو گر عکس بدریا فگند
خار قلاب بود در بدن ماہی ما — (شیخ علی حزیں)

کہاں گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ
بسان خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ — (مرزا غالب)

پس جب "ماہی ما" اور "میرے آئینے" سے میں مراد ہو سکتی ہے تو لب اظہار سے لب مراد کیوں نہ ہو! اور اظہار اور شور میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں۔ ایک اور تشریح پیش کرتا ہوں، شاید مسمع قبول سے شرف اندوز ہو۔ شور کو لب کی ساتھ اظہار میں مشارکت ہے۔ گویا یہ استعارہ بکلف ہے اور استعارہ بکلف تمام فصحا کے نزدیک جائز ہے۔ علم معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لے کر پڑھیے اس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھیے گا۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے ہیں کہ استعارے کا میدان وسیع ہے۔ شاعر اہل زبان کے محاورات

۱۔ "مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را" کی طرف اشارہ ہے یعنی اگر رنگ کو توڑنا جائز ہے تو شور کا لب بن جانا کیوں باعث تعجب ہو۔

کا پابند ہونا ہے اور یہ پابندی ضروری ہے لیکن اہلِ زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ اگر متقدمین نے "گلشن طور" لکھا ہے تو ہم ہمیشہ گلشنِ طور ہی لکھا کریں۔ جس شخص نے ملا ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا "آتش بیگانہ" مسموع نہیں ہے، میری رائے میں وہ غلطی پر تھا کیونکہ ظہوری کا تخیل ایرانیوں کے تخیل کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال سے بیدل علیہ الرحمۃ نے فارسیوں کی پروانہ کرکے "خرام کلشتن" دہر کہ دو قدم خرام می کاشت" لکھ دیا اور نافہموں نے ان کی آزادیٔ تخیل کو سہام اعتراض کا نشانہ بنایا۔ متقدمین میں سے ناصر علی سرہندی اور مرزا جلال اسیر بھی ان قیود سے آزاد ہیں۔ خواجہ آتش "گرگ بغل" تحریر فرماتے ہیں اور حضرت امیر کے اشعار سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ؎

ہم بار خاطرِ قفس و آشیاں نہیں

غالباً "گرگ بغل" اور "خاطرِ قفس" کا استعارہ آپ کسی ایرانی یا اردو شاعر کے کلام میں نہ پائیں گے۔ پس میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق کو حاصل نہیں۔ الا اس صورت میں جب کہ استعارہ اصلیت سے معرا ہے .... اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس طرح میں نے "لب" سے مراد "آوازِ لب" یا گفتار لی ہے، اسی طرح شیخ علیہ الرحمۃ اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آوازِ ناقوس

لکھتے ہیں:

سر کافر شدن داریم کو بت خانۂ عشقے
کہ ناقوسش بجائے نغمہ یا می شود مارا

اقبال کا ایک مصرع تھا، "اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے" معترض نے لکھا کہ "سو افتاد" کی جگہ "سو افتادیں" ہونا چاہیے تھا۔ اس کے جواب میں بھی اقبال نے خواجہ آتش، تسلیم، جلال کے اشعار نقل کرکے معترض کو خاموش کرایا۔ اس کے بعد اقبال کے اس مشہور مصرع پر "مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی" اعتراض کیا گیا۔ اقبال نے لکھا کہ معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر ہے یا مفہوم پر، سیدھا کرنا یہاں انھیں معنوں میں لکھا گیا ہے جن معنوں میں میر ممنون دہلوی نے لکھا ہے:

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سیدھا اس کو
سرو گلشن کو بہت دعویٰ رعنائی تھا

اگر آپ کہیں کہ محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں ہو سکتا تو صحیح نہیں، ظفر مرحوم کا مطلع ہے:

عشق میں کیا ہم ہی اے تقدیر سیدھے ہو گئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہو گئے

اصل میں سیدھا کرنا فارسی محاورہ "راست کردن" کا ترجمہ ہے اور یہ محاورہ صوفیۂ کرام کے اشعار میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہی وہ راستی ہے جو عشق کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا اثر سکندر کے آئینہ کو جام جہاں نما بنا سکتا ہے، حرماں نصیب اقبال کو اسی راستی کی آرزو ہے"۔

اقبال کی منکسر مزاجی اور طالب علمانہ ذہنیت کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ جب تنقید ہمدرد "نے" میں نے کہنا ہے "پر اعتراض کیا کہ یہ غلط اور خلاف محاورہ ہے تو اقبال نے اپنے جواب میں اس غلطی کو تسلیم کر لیا اور لکھا کہ پنجاب میں چونکہ "نے" کا یہ استعمال عام ہے اس لئے بعض اوقات بے خیالی کے عالم میں ہم لوگ اسے شعر میں باندھ دیتے ہیں لیکن اس کے خلاف محاورہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

آخر میں اقبال پھر اپنے انکسار کی طرف عود کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:
قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے نہ زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔ راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں:

نیم من در شمار بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستاں قفس مشت پرے دارم

اس مضمون سے اتنے طویل اقتباسات نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آج کل کے شعرا و ادبا اس سے رہنمائی حاصل کریں اور ان کو معلوم ہو کہ اقبال علوم مغربی کے بحر بے پایاں ہونے کے باوجود فارسی اور اردو شاعری اور ان دونوں زبانوں کے غوامض کا کتنا بڑا ماہر تھا اور اس کا یہ مبلغ علم اس وقت تھا جب اس کی عمر ابھی پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ جب تک ہمارے شعرا اپنے قدیم ذخیرہ

ادب و شعر سے ناواقف اور بے بہرہ رہیں گے، وہ دنیائے شعر میں کسی عظمت و اہمیت کے حقدار نہ ہو سکیں گے۔

جنوری ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں بھی اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا: بچوں کی تعلیم و تربیت"۔ اس مضمون میں اقبال نے تعلیم اطفال کے طریق اور نفسیات اطفال کے مطالعے کے متعلق نہایت گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ افسوس کہ قلتِ گنجائش کی وجہ سے اس مضمون کے زیادہ اقتباسات نقل نہیں کیے جا سکتے۔ تعلیم کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں:

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نفس ناطقہ قوا کا ایک مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد منقسم شے ہے اور اس کی ہر ایک قوت کا نشوونما ہر دوسری قوت کے نشوونما پر منحصر ہے جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں، اسی طرح نفس ناطقہ کے قوا کا نشوونما بھی انھیں اصولوں کے تحت میں ہو۔ لہذا طریقۂ تعلیم وہی کامل ہو گا جو نفس ناطقہ کے تمام قوا کے لئے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے، ادراک، فکر، تخیل، تاثر اور مشیت، غرض نفس ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیے کیونکہ کامل طریق تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوری پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں، نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔

آخری پیراگراف ملاحظہ ہو:

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لئے بچے کے نشو و نما کا مطالعہ کہاں تک ضروری ہے۔ معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انھیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلم کی کارگزاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہیے۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم کو اعلیٰ درجے کے علمی اصولوں پر قائم کریں جس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچا عشق پیدا ہو جائے گا جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سرسبزی مخفی ہے جس سے قومیں معراج کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔[۱]

آغاز سے ۱۹۰۵ء تک کی جو نظمیں "بانگِ درا" میں درج ہیں ان کی

۱۔ مخزن جنوری ۱۹۰۲ء

تعداد غزلوں کے علاوہ ۹۳ ہے۔ ان میں سے اکثر "مخزن" میں بعض پیسہ اخبار میں اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان نظموں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر فطرت، ہنگامہ کائنات اور حسن و جمال کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے شاعر سراپا استفہام و استفسار ہے۔ اس کے دل میں ایک تڑپ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقائق اشیاء میں ڈوب کر ان کا سراغ لگائے۔ حکمت، و تصوف کی جس فضا میں اقبال نے تربیت پائی تھی اور اس کے بعد فلسفے سے جو ایک رشتہ استوار کیا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ سراپا تلاش و تجسس ہوتے اکثر نظموں میں تفکر کی طرف رجحان صاف طور پر نظر آتا ہے یہاں تک کہ وہ کنار راوی" پر کھڑے ہو کر ایک تیز رو کشتی کو دیکھتے ہیں تو دور فاصلے پر اس کی غائب ہو جانے پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی — ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہی یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا — نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

یہی وہ چیز ہے جو اقبال کو دور حاضر کے دوسرے شعرائے ممتاز کرتی ہے۔ کوئی رومانی شاعر ہوتا تو راوی کے کنارے کھڑے ہو کر اپنے سوز فراق اور شام غم کا رونا روتا لیکن اقبال اس منظر کو دیکھ کر انسان کی ابدیت کا قائل ہو جاتا ہے اور اس حکمت کو نہایت وثوق سے بیان کرتا ہے۔

اس حصے میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جو انگریزی شاعری سے ماخوذ ہیں اور چند ایسی بھی ہیں جو اپنے انداز کی ندرت کی وجہ سے گو بہ ظاہر انگریزی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت طبعزاد ہیں اور اس امر کا پتا دیتی ہیں کہ شاعر اپنے

اظہار کیلئے جدید اسلوب پیدا کر رہا ہے جو معاصرین سے بالکل الگ اور ممتاز ہے۔

بعض نظموں میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے، مثلاً ہمالہ، آفتاب، شمع، خفتگان خاک سے استفسار، لیکن بعض حیرت انگیز طور پر سادہ اور آسان واقع ہوئی ہیں۔ ان نظموں کو چھوڑ کر جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، ایک آرزو، عقل و دل، عشق اور موت، طفل شیر خوار، ترانۂ ہندی، جگنو، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا گیت کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے۔ ایک آرزو، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا گیت اور "تصویر درد" کے ایک دو بند اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ اس زمانے میں اقبال وطنیت ہندی اور قومیت متحدہ کے تصورات کی طرف مائل تھے اور اہل ہند کو جہالت، نفاق، امتیاز ملت و آئین اور ذوق محکومی سے نفرت دلانا چاہتے تھے۔ ترانۂ ہندی بھی اسی زمانے کی چیز ہے۔ اس دور میں صرف ایک نظم بلال ایسی ہے جسے خالص اسلامی کہنا چاہیے، باقی تمام نظمیں مفکرانہ یا وطن پرستانہ ہیں۔

اسی زمانے میں علامہ نے علم سیاست مدن پر ایک کتاب علم الاقتصاد کے نام سے اردو میں لکھی، چونکہ اس کی حیثیت بالکل ابتدائی علمی کوشش کی تھی اس لئے علامہ نے اس کو دوبارہ شائع کرانے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی بلکہ اگر کسی نیاز مند نے اس کا ذکر کیا تو علامہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ کتاب اب بہت پرانی (آوٹ آف ڈیٹ) ہو چکی ہے۔

۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے، اقبال کو مولانا میر حسن کے بعد تلمیذانہ وابستگی صرف ڈاکٹر آرنلڈ سے تھی، وہ

ان کی روانگی نے بحد متاثر ہوئے. چنانچہ "نالہ فراق" ایک نظم لکھی جو "بانگ درا"
کے صفحہ ۸۸ پر درج ہے. اس میں استاد کی عظمت، اپنی تشنگی علم اور عزم
انگلستان کا اظہار کیا گیا ہے اور فرماتے ہیں :

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

اس کے بعد اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ کا عزم مصمم کر لیا
کچھ رقم تو اقبال نے اپنی ملازمت کے دوران میں پس انداز کر رکھی تھی اور باقی
کے لیے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے یقین دلایا. مرزا جلال الدین صاحب
بیرسٹر فرماتے ہیں: میں ۱۹۰۰ء میں بیرسٹری کے لیے انگلستان گیا تھا، شیخ عبدالقادر
میرے بعد گئے، میں ہی ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر پہنچا اور شیخ صاحب
دو ہفتے میرے ہی ہاں مقیم رہے. جب میں ۱۹۰۵ء میں واپس آنے لگا تو شیخ
صاحب نے مجھے تاکید کی کہ لاہور پہنچتے ہی شیخ محمد اقبال سے ملنا، وہ ولایت آنا
چاہتے ہیں. جو معلومات وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ انھیں مہیا کر دینا. میں نے لاہور
پہنچتے ہی موجودہ ریلوے روڈ اور چیمبرلین روڈ کے چوک میں ایک مکان اپنے
دفتر کے لیے کرایہ پر لیا. مولوی سید ممتاز علی مرحوم کے دارالاشاعت کا دفتر قریب
ہی تھا. ایک دن اقبال مولوی صاحب ہی کی وساطت سے میرے پاس
آئے اور ولایت کے سفر و قیام اور تعلیم کے متعلق سوالات کرتے رہے. دوسری
دفعہ بھی آئے تو مزید معلومات دریافت کیں اور پھر میں نے سنا کہ وہ انگلستان
روانہ ہو گئے ہیں.

"میں نے عدالت ضلع میں وکالت شروع کی تھی، مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین نامور وکلا میں سے تھے اور اقبال سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ یہ حضرات مجھ سے اقبال کی قابلیت اور شاعری کی اکثر تعریفیں کرتے رہتے، میں کہتا کہ افسوس ہی میں اقبال سے کچھ زیادہ خلا ملا پیدا نہ کرسکا۔ اب وہ ولایت سے واپس آئیں گے تو ان سے باتیں ہوں گی۔"

اقبال کو فقرا و اولیائے سے گہری عقیدت تھی، جب وہ انگلستان کو روانہ ہوئے تو پہلے دہلی میں حضرت نظام الدین (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار پر حاضر ہوئے اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی "بانگِ درا" کے صفحہ ۷۹ پر درج ہے، پہلا شعر ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

آگے چل کر گزارش کی ہے:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشین صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے

کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

اپنے گھر اور والدین کا ذکر کرنے کے بعد مولانا میر حسن کے متعلق فرماتے ہیں:

وہ شمع بارگہہ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

اس کے بعد اپنے برادرِ معظم شیخ عطا محمد کے متعلق لکھتے ہیں:

وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمع محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عشق میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

ظاہر ہے کہ یہ دعا لفظ بہ لفظ پوری ہوئی۔ اقبال یورپ سے ملک و ملت کے لیے مایۂ ناز ہستی بن کر واپس آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں تاثیر بھی عطا فرمائی اور انھوں نے واپس آکر والدین، اُستادِ محترم اور برادرِ معظم کو بہ عافیت اور خوش و خرم بھی دیکھا۔

تیسری فصل

اقبال یورپ میں

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو

ٹرینٹی کالج کیمبرج

۱۹۰۵ء میں اقبال احباب کی نیک خواہشوں اور بزرگوں کی دعاؤں سے لدے پھندے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچتے ہی کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخل ہوئے۔ چونکہ مشرقی علوم میں بہرۂ وافی رکھتے تھے اور عمیق غور و فکر کی عادت تھی اس لئے روزِ اوّل ہی سے اپنے ہم سبق طلبہ خصوصاً ایشیائی ممالک کے نوجوانوں میں بیحد مقبول و ممتاز ہو گئے۔ بڑے بڑے باکمال اساتذہ کو بھی اس ہندی نوجوان کی امتیازی قابلیتوں کے باعث اس سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ پروفیسر آرنلڈ تو خیر ان کے پرانے استاد تھے، مشہور معلم فلسفہ پروفیسر میک ٹیگرٹ سے اقبال نے اپنے مخصوص مضمون یعنی فلسفے کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے ملاقاتیں کیں۔ عربی و فارسی کی تحصیل و تحقیق کا ذوق و شوق جو ان دنوں انگریزی کے مقابلہ میں کسی قدر دب گیا تھا از سرِ نو تازہ ہو گیا۔

اور اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ایران کے فلسفہ مابعد الطبیعی کا مضمون منتخب کیا اور قرار دیا کہ یہ ڈگری میونک (جرمنی) یونیورسٹی سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ اس کے لئے وہ جرمنی بھی گئے اور برلن میونک، ہائیڈل برگ اور دوسرے مقامات پر تحقیق و تفتیش علمی میں مصروف رہے۔

تصوّف اور شعر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے ذہن میں مختلف مشغولیتوں کی وجہ سے ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی تھی، وہ ابتدائی تربیت اور خاندانی رجحان کے اثر سے تصوّف کی طرف مائل تھے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے مطالعہ و تحقیق کے دوران میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مروجہ تصوف کے اکثر پہلو اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے کے چند سال بعد جب لاہور میں راقم الحروف اقبال سے ملا تو ایک صحبت میں انھوں نے بڑے شد و مد سے فرمایا کہ میں نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی حکمۃ الاشراق کوئی دس دس دفعہ بالاستیعاب اور نہایت غور و خوض سے پڑھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علم و ذوق میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کتابوں کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں کم از کم میں انھیں عقائد و تعلیمات اسلامی سے تطابق نہیں دے سکتا۔ اسی زمانے میں علامہ نے خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے اور براہِ راست بھی مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواری سے خط و کتابت کی، مقصود یہ تھا کہ اپنے مقالے کی تیاری کے لئے تصوف اور وحدت الوجود کے متعلق زمانے کے ممتاز صوفیہ سے بھی مذاکرہ ہو جائے۔ آپ نے شاہ صاحب سے جو استفسارات کیے ان کا مفاد یہ تھا کہ :

(۱) قرآن حکیم میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں انکا پتا دیجیے۔
(۲) وحدت الوجود کا مسئلہ کن کن آیات سے نکلتا ہے۔
(۳) تاریخی اعتبار سے اسلام اور تصوف کا کیا تعلق ہے۔
(۴) کیا حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؛ شاہ صاحب نے ان سوالات کے جوابات دیئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان سے علامہ کی تسکین نہیں ہوئی۔ یہ خط و کتابت کا سلسلہ طویل وقفوں سے ۱۹۱۶ء تک جاری رہا جب علامہ نے مثنوی اسرارِ خودی کا ایک نسخہ شاہ صاحب کی خدمت میں ارسال کر کے ان کی رائے طلب کی تو خواجہ حسن نظامی نے بھی دوسرے صوفیوں کی طرح مثنوی کے اس حصے پر اعتراضات کئے تھے جس میں خواجہ حافظ کے متعلق چند اشعار شامل تھے۔ شاہ صاحب نے علامہ کے اشعار و اقوال کا جواب یہ دیا صحابہ کرام میں جوش و مستی کا غلبہ تو ہوتا تھا مگر وہ اس میں پڑے نہیں رہتے تھے بلکہ انھوں نے عالمِ صحو میں نشو و نما پائی۔ سکر میں چونکہ نقص ہے اس لئے خدا نے ان کو اس حالت میں نہ رکھا اور وہ تمام عالم کے لئے کامل و مکمل ہوئے۔ پھر وہ حافظ شیراز کی طرح "خود گویم و خود رقصم، خود چنگ خوش آوازم" کا مصداق کیونکر رہ سکتے تھے" یعنی دوسرے لفظوں میں شاہ صاحب نے اقبال کی تائید فرمائی اور تسلیم کیا کہ حافظ شیراز کا عالم عالمِ صحو نہیں بلکہ سکر ہے اور سکر نقص کی دلیل ہے۔

(حسن مثنیٰ ندوی نے رسالہ "ریاض" کراچی، (جنوری و مارچ ۱۹۵۵ء کے دو پرچوں میں شاہ صاحب اور علامہ کی خط و کتابت نقل کی ہے، تفصیل کے لیے یہ پرچے دیکھنے چاہئیں)۔ اقبال کا دوسرا مشغلہ شعر تھا اس میں بھی وہ گو مگو میں

پڑے ہوئے تھے۔ ادبی و لسانی تربیت تمام تر مشرقی اور اسلوبِ اظہار کا نیا تقاضا مغربی۔ چنانچہ انھوں نے اکثر ایسی نظمیں لکھیں جو مغربی شعرا کے اندازِ فکر کا چربہ معلوم ہوتی تھیں۔ علاوہ بریں وہ کبھی کبھی غزلیں بھی کہہ لیتے تھے۔ اس صورتِ حال میں ایک دفعہ انھوں نے ترکِ شعر کا ارادہ کر لیا اور اپنے احباب سے بھی کہہ دیا کہ اب میں شعر نہیں کہوں گا۔ شیخ عبدالقادر ان دنوں انگلستان ہی میں تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا انداز اساسی طور پر مشرقی ہے اور آپ کی شاعری ملک و قوم کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ اس لیے ترکِ شعر کے ترک کا ارادہ مناسب نہیں۔ بہت سی بحثیں ہیں کے بعد دونوں دوست پروفیسر آرنلڈ کے پاس گئے اور ان سے اس معاملہ میں مشورے کے طالب ہوئے۔ بوڑھا استاد نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں سے باخبر تھا، اس نے اقبال کو ایسے ارادے سے روکا اور کہا کہ آپ کو ضرور شعر کہتے رہنا چاہیے اور اس مشغلے کو چھوڑ دینا بڑا ظلم ہوگا۔ چنانچہ اقبال نے اپنا فیصلہ منسوخ کر کے استاد کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

انگلستان اور جرمنی میں اقبال کی متعلمانہ زندگی کے متعلق بعض کارآمد تفصیلات عطیہ بیگم فیضی کے مجموعۂ خطوطِ اقبال سے ملتی ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں اقبال کے بعض خطوط اور مصنفہ و متعلمین کی بعض مجالس کے سوا کچھ نہیں لیکن چونکہ یہ ماخذ صحیح معاصرانہ اور مستند ہیں اس لیے ان کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ان ماخذ سے استفادہ کیا جائے گا۔ اگرچہ اقبال لاہور سے ایم۔ اے کرنے کے بعد انگلستان گئے تھے لیکن کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے کر از سرِ نو گریجویٹ ہونا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ اس وقت

تک انگلستان کے مقیم ہندوستانیوں میں اور انگلستان کے تعلیم و تعلم کے حلقوں میں اقبال کی حاضر دماغی، قابلیت اور علمی فضیلت کا خاصا چرچا ہو گیا تھا۔ مس بیک لندن میں ہندوستانی طلبہ کی امداد، دیکھ بھال اور خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں اور کبھی کبھی اپنے ہاں ان کو کھانے کی دعوت دے کر باہم ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع بھی دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں عطیہ بیگم بھی انگلستان میں تحصیل علم کے لیے مقیم تھیں۔ مس بیک نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ بیگم کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا جس میں انھیں بتایا کہ آج آپ کی ملاقات ایک قابل آدمی محمد اقبال سے ہوگی جو کیمبرج سے محض آپ کی ملاقات کے لیے یہاں وارد ہوا ہے۔ عطیہ بیگم نے اس وقت تک اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا لیکن چونکہ مس بیک کی دعوت تھی اس لیے وہ پہنچ گئیں۔ کھانے کی میز پر

زبان دان ظریف اور طناز

محمد اقبال موجود تھے عطیہ بیگم لکھتی ہیں: میں نے دیکھا کہ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت میں درخور وائی رکھتے تھے۔ حاضر جواب، ظریف اور طناز تھے۔ گفتگو میں کسی مخاطب کی ذرا سی کمزوری سے بھی فائدہ اٹھا جاتے تھے اور حاضرین پر تابڑ توڑ چوٹیں کرتے چلے جاتے تھے۔ حافظ پر گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے اس شاعر کے کمالات کا اعتراف کیا بلکہ یہ کہا کہ جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں، اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہو جاتی ہے گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔ اس دن اقبال نے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر بھی کیا جس کو ہندوستان میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ تم بابا فغانی کا

کلام ضرور پڑھو کیونکہ زندگی کے متعلق ان کا تصور بہت مختلف اور دلچسپ ہے۔

داخلی و خارجی شخصیتیں

چند روز بعد اقبال نے مجھے ایک تناول خانے میں کھانے کی دعوت دی جس میں چند جرمن اسکالر بھی شامل ہوئے جن کے ساتھ اقبال ان دنوں ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس ڈنر میں ہر چیز آراستہ و پیراستہ اور باقاعدہ اور خوش نما ہے۔ میں نے اس حسن ترتیب کی داد دی تو اقبال نے کہا:

میرے قالب میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں: بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کاروباری قسم کی ہے اور اندرونی شخصیت تخیل، تصوف اور تصور کا پیکر ہے۔

اس تقریب پر جرمن اسکالر اور اقبال کے ساتھ جو گفت گو ہوئی وہ انتہا دل آویز اور بے حد معلومات افزا تھی۔ اس کے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل کو ایک دعوتِ چائے دی جس میں اقبال کے علاوہ بعض دوسرے صاحبانِ علم و فن بھی تھے مثلاً مس سیلوسٹر اور مس لیوی جو انسانیات اور فلسفے کی طالبات تھیں اور موسیو مارٹل اور ہیر مینز ٹرائتھ جو مشہور موسیقار تھے۔ یہ مجلس بے حد پُر رونق اور درخشاں تھی۔ ادھر اقبال فی البدیہہ اشعار سنا رہے تھے، ادھر وہ لڑکیاں چہک رہی تھیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں۔ اس پر اقبال نے کہا کہ اس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، بس پڑھے گئے اور قصہ ختم ہوا، ان کو نقل کرنا بیکار ہے۔ موسیقاروں نے نغمہ و ساز کی دلفریبیوں سے ہمیں مسحور کر دیا اور یہ محفل مدتوں تک سب کو یاد رہی۔

۲۲ اپریل کو عطیہ بیگم، اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج کو روانہ ہوئے اور سید اور بیگم سید علی بلگرامی کے ہاں پہنچے جہاں اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ علمی مذاکرات ہوئے۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں کہ کبھی کبھی اقبال ماندہ و افسردہ معلوم ہوتے تھے اور بادی النظر میں محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ ایک حرف زبان سے نہ نکالیں گے لیکن جہاں کہیں ہم صحبت شخص کی زبان سے کوئی قابلِ جواب فقرہ نکلا، اقبال کا فقرہ بجلی کی طرح کوند گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ جب وہ بظاہر تھکا ماندہ اور افسردہ ہو تو گویا کسی مدمقابل پر چوٹ کرنے کے لئے تیاری میں مصروف ہوتا ہے۔ اس سے مجھے مسٹر گلیڈ سٹون یاد آگئے جو پارلیمنٹ میں اسی طرح غیر متوقع طور پر ایسی چوٹ کرتے تھے کہ مدمقابل بوکھلا جاتا تھا۔

زندگی اور موت

یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی، دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذی علم لوگ جمع تھے۔ پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت وحیات کے مسئلے پر بحث کرنے لگے، گوناگوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہو گیا۔ اقبال خاموش بیٹھے تھے، پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے: "آپ بھی تو کچھ کہیئے" اقبال نے جھٹ کر کہا "زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز ہے"، بس اس جامع فقرے پر بحث ختم ہو گئی۔

استاد اور شاگرد

۹ جون کا ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے یہاں ایک ڈنر پر اقبال بھی تھے۔ پروفیسر نے ذکر کیا کہ جرمنی میں نہایت

نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے جس کی تصحیح اور جس کے اقتباسات کے لیے میں اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں کیونکہ اس ذمہ دارانہ کام کے لئے صرف یہی موزوں رہیں گ۔ اقبال نے گزارش کی کہ میں اپنے استاد کے مقابلہ میں بالکل طفلِ مکتب ہوں، پروفیسر نے کہا کہ نہیں، میری رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہوگا۔ اقبال نے خفیف سو طنزیہ لہجے میں جواب دیا "جناب والا! اگر آپ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں تو میں استاد کی رائے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کے احکام کی تعمیل کروں گا۔" پروفیسر آرنلڈ اقبال کا مطلب سمجھتے تھے اور متیقن تھے کہ اس معاملہ میں اقبال ان سے بہتر قابلیت رکھتے ہیں لیکن یہ ساری گفتگو اس قدر نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ہوئی کہ صرف اہلِ علم ہی اس کے اہل ہو سکتے ہیں۔

دلچسپ محفل

۲۳ جون کو عطیہ بیگم کے مکان پر چند انگریز اور ہندوستانی مہمان جمع ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا، لارڈ سنہا کی لڑکیوں (کومولا اور رومولا) نے بھی موسیقی میں اپنا کمال دکھایا، اقبال نے تمام شرکاء مجلس کے متعلق ایسے فی البدیہہ اشعار پڑھے کہ سب سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون مس شولی نے دوستوں کو ہندوستانی کھانے کی دعوت دی عطیہ لکھتی ہیں کہ میں وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ اقبال وہیں موجود ہیں اور ہندوستانی کھانے تیار کرانے میں مس شولی کو نہایت ماہرانہ مشورے دے رہے ہیں۔ یہ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ یہاں سے سب لوگ امپیریل انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ تقریب میں چلے گئے جہاں بڑی رونق تھی اس لیے کہ قصرِ شاہی کے اکابر بھی موجود تھے (یعنی شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے شہزادے شہزادیاں) سب حاضرین

دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے لیکن اقبال بار بار کہہ رہے تھے "یہ ایک دلچسپ تضیع اوقات ہے۔"

۲۹ رجون کو ایک معزز خاتون لیڈی ایلبیٹ نے ایک پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پرتکلف لباس اور جھلملاتے زیورات پہنے جھم جھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں۔ لوگ ان کے اس ذوق پسندت کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ انھوں نے دفعتاً اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میں تو صرف آپ سے ملنے کیلئے یہاں آگئی ہوں۔" اقبال کی طبیعت کا شعلہ چمکا اس نے کہا:

"تو یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا اس کمرے سے زندہ سلامت باہر جا سکوں گا۔"

جولائی کے آغاز تک اقبال جرمن زبان کے امتحان کے سلسلے میں "تاریخ عالم" لکھ چکے تھے۔ اس کے بعد چند روز میں اقبال نے اپنے مقالات احباب کو سنائے اور جولائی کے تیسرے ہفتے میں جرمنی چلے گئے۔

عطیہ بیگم ایک اور مجلس مکالمہ کا حال سناتی ہیں کہ ۲۳ رجولائی کو لندن میں بعض ہندوستانی جمع ہوئے تو ایک طالب علم برمیشر لال نے ذکر کیا کہ میرے پاس وطن سے جو خطوط آئے ہیں، اور ایک اردو کا رسالہ "مخزن" موصول ہوا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو قوم پرستانہ نظمیں اور گیت لکھے ہیں، ان سے شمالی ہند کے کوچہ و بازار اور مدرسے گونج رہے ہیں اور ان سے قوم پرستی کا ایک ایسا جذبہ بیدار ہو گیا ہے جس کی مثال ہندوستان میں اس سے

پیشتر موجود نہ تھی. اس کے بعد طالب علم نے وہ نظمیں گا گر سنائیں. سب ہندوستانی اس سے آواز ملا کر گانے لگے اور ہال گونج اٹھا.

جب شور کم ہوا تو عطیہ بیگم نے اقبال کا جرمنی سے آیا ہوا تازہ خط پڑھا. یہ خط جرمن زبان میں لکھا ہوا تھا تعلیم یافتہ لوگ اس خط کی زبان اور اسلوب تحریر کی پاکیزگی پر بیحد متعجب ہوئے بلکہ پروفیسر آرنلڈ نے بڑی منت سماجت سے یہ خط عطیہ بیگم سے لے لیا کہ میں اس خط کو بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھوں گا. اس سے پہلے بھی پروفیسر آرنلڈ اقبال کے دو مسودے عطیہ بیگم سے چھین کر محفوظ کر چکے تھے.

اقبال کی اُستانیاں

جرمنی میں اقبال کا زیادہ وقت ہائیڈل برگ میں بسر ہوا کیوں کہ ایک تو اس یونیورسٹی میں ان کے مقالات کے متعلق تحقیق و تدقیق کی سہولتیں زیادہ تھیں، دوسرے یہ شہر جرمنی کے سیاسی مرکزوں سے الگ تھلگ نہایت سکون سے زندگی بسر کر رہا تھا وہاں پہنچ کر اقبال بہت جلد بے تکلف اور مخلص بالطبع ہو گئے لیکن وہاں کی علمی فضا اتنی وسیع و متین تھی کہ اقبال نے اپنی لندن والی شوخی، طراری اور طنازی کو ترک کر کے انکسار اختیار کر لیا. دو جوان اور حسین پروفیسر عورتیں، فراؤ پروفیسر واژناسٹ اور فراؤ پروفیسر سینے شال اقبال کی استاد تھیں جو انھیں فلسفے کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتی تھیں. یہ یونیورسٹی کے تدریسی معمولات کے علاوہ ہر طالب کشتی رانی، موسیقی باغبانی، کوہ پیمائی وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کر لیتا تھا اور کبھی کبھی اقبال بھی ان مشغلوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے. یونیورسٹی ہاسٹل میں کوئی ایک سو

طالب علم اور پروفیسر رہتے تھے اور اس ہوسٹل کی منتظمہ ایک ستر سال کی بزرگ خاتون فراؤ پروفیسر ہیرن تھیں جو پورے ہائیڈل برگ میں قابل ترین استاد تسلیم کی جاتی تھیں اور موسیقی میں بے حد مہارت رکھتی تھیں۔ اس یونیورسٹی میں معلم و متعلم کا معیارِ زیست بالکل یکساں تھا اور بادی النظر میں ان کے درمیان امتیاز کرنا دشوار تھا، صرف تعلیم و تدریس کے اوقات میں یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ طلبہ کون کون ہیں، ان کے پروفیسر کون کون ہیں اور ان کے مبلغ علم کا کیا عالم ہے۔ ہاسٹل میں طلبہ تو اپنے قیام و طعام کے لئے مقررہ فیس ادا کرتے تھے لیکن پروفیسروں کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ ان کے قیام و طعام کا انتظام بلا معاوضہ کیا گیا تھا۔

دن بھر کی رسمی تعلیم کے خاتمے پر طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور وہاں دونوں خاتون پروفیسر یا جرمن، یونانی اور فرانسیسی فلسفے پر مذاکرہ شروع کر دیتیں۔ اقبال ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے اور ایک ایک لفظ کو بغور سنتے، خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلومات علمی سے بہت مرعوب تھے اور جب کبھی وہ اقبال کے کسی غلط جواب پر انھیں ٹوکتیں تو اقبال سکول کے بچے کی طرح پشیمان ہوتے۔ اس بے تکلف علمی مجلس کے بعد یہ سب لوگ کافی ہاؤس سے نکل کر پاس ہی ایک پہاڑی پر چڑھ جاتے جس پر پہنچنے کے لئے ایک ہزار سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں اور سب لوگ تکان سے بچنے کے لئے گاتے ہوئے چڑھتے لیکن یہ گانا اکثر بے سرا ہوتا تھا۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ وادی نیکر کا بہترین منظر اسی پہاڑی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال پر عالم استغراق

۲۲ر اگست کو ایک عجیب واقعہ ہوا: طلبہ اور پروفیسروں نے ایک پکنک کا انتظام کیا اور ہر شخص کو اس کے مسکن سے ساتھ لیتے گئے۔ اقبال کا مسکن اس راستے پر آخری تھا۔ وہاں پہنچے تو اقبال پکنک پر جانے کے لیے تیار ہونے کے بجائے ایک عالم مدہوشی میں خاموش اور بے حرکت بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ شب گزشتہ ہی سے اس عالم میں ہیں۔ سامنے ایک کتاب کھلی ہے اور بالکل پتھر کے بت کی طرح اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بیٹھے خلا میں گھور رہے ہیں۔ طلبہ یہ دیکھ کر بے حد حیران ہوئے اور دونوں پروفیسر خاتون کی تشویش تو لا انتہا تھی۔ طرح طرح کے اندیشوں کی وجہ سے کوئی اقبال کے پاس نہ پھٹکتا تھا، آخر عطیہ بیگم نے جرأت کی اور اقبال کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا جس پر وہ کسی قدر ہوش میں آئے۔ عطیہ بیگم نے کہا کہ آپ ہندوستان میں نہیں بلکہ جرمنی میں ہیں۔ یہاں آپ کے ان حالات و واردات کو نہ کوئی سمجھے گا اور نہ ان کی قدر کریگا اس لیے "سکر" کو چھوڑ کر "صحو" کی حالت میں آیئے۔ اس کے بعد اقبال بالکل ہوش میں آگئے اور پکنک میں شریک ہوئے جس کے آخر میں انھوں نے اپنے نفسیاتی واردات کے متعلق عطیہ سے گفتگو کی۔

ہائیڈل برگ کے معلمین و متعلمین اسی طرح پڑھتے لکھتے اور ہنستے کھیلتے رہتے تھے اور اقبال اپنی علمی و تفریحی خصوصیتوں کی وجہ سے ان میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ۲۵ر اگست کو یہ قافلہ "اسمانی باغ" کو روانہ ہوا جس کو اقبال "باغِ فردوس" کہا کرتے تھے۔ اس باغ میں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کررکھی تھیں جن میں ایک مسجد بھی تھی۔ باغ آبشاروں، جھیلوں، خوشنما

نشست گاہوں اور گوناگوں پھلوں اور پھولوں سے آراستہ اور مالا مال تھا مسجد بہت شاندار تھی اور اس کے چاروں طرف اللہ تعالیٰ کے اسمار عربی حروف میں کندہ تھے بلکہ بعض مقامات پر آیاتِ قرآنی بھی ثبت تھیں. سب نے چاہا کہ اقبال انھیں ان آیات کا مطلب سمجھائیں، اس پر اقبال نے نہایت سنجیدگی سے یہ قصہ سنایا:

ایک تھا بادشاہ، اس کو ایک دن جنت کی حور نظر آئی جس پر وہ بُری طرح فریفتہ ہو گیا اور اس سے کہنے لگا کہ تم میری ملکہ بن جاؤ. حور نے کہا کہ میں تمہاری ملکہ بننے کو تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک مسجد تعمیر کراؤ، بس اسی مسجد میں تم سے نکاح پڑھوالوں گی، بادشاہ نے حور کے حکم کی تعمیل کی مسجد تیار ہوئی. بادشاہ کا حور سے نکاح ہو گیا.

اس گھڑنت پر ہندوستانی طلبہ تو ہنسنے لگے لیکن اقبال ایسے متین و سنجیدہ رہے کہ دوسروں کو اس واقعے کے تاریخی ہونے کا یقین ہو گیا.

۲۸ اگست کو اقبال میونک گئے. اس سے قبل انھوں نے اپنے اولین اسباق میونک ہی میں حاصل کیے تھے اور پروفیسر ان کی حسین و طرحدار بیٹی ان کی معلم و اتالیق رہی تھی. جب اقبال دوسرے طلبہ کے ساتھ پروفیسر ان سے ملنے گئے تو دورانِ ملاقات میں ان کی صاحبزادی نے اقبال کا امتحان لینے کی غرض سے بعض سوالات کیے اور اگرچہ اقبال ہائیڈل برگ میں رہ کر مزید بہت

کچھ سکیچ جکے تھے، لیکن اس کے باوجود اس خوبصورت معلمہ نے اپنے اعتراضات سے اقبال کو خاصا پریشان کیا۔ اس کے بعد وہ حسینہ پیانو پر جا بیٹھی اور موسیقی کے بعض نغمے ایسی خوبی سے گائے کہ سب لوگ اس کے فنی کمالات پر دنگ رہ گئے۔ اسی معلمہ کے زیر نگرانی اقبال نے اپنا وہ مشہور مقالہ مرتب کیا تھا جس پر انھیں میونک یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔

اس کے بعد اقبال واپس ہائیڈل برگ آگئے اور کچھ مدت گزرنے پر لندن واپس چلے گئے تاکہ بیرسٹری کی تکمیل کریں۔ ان دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے چھ ماہ کی رخصت حاصل کی تو اقبال ان کی جگہ عربی کے معلم مقرر کر دیئے گئے۔

سیّد امیر علی شاہ کے ساتھ

مئی ۱۹۰۸ء میں بہ مقام ویسٹ منسٹر (لندن) کیکسٹن ہال میں امیر علی ایم۔ اے۔ سی۔ آئی۔ ای کے زیر صدارت مسلمانان مقیم لندن کا اجلاس ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاح کیا گیا۔ سید امیر علی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا مجلس عاملہ کے ممبر چنے گئے۔ قواعد و ضوابط وضع کرنے کیلئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سید امیر علی کے ساتھ میجر سید حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال شامل کئے گئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں اقبال بی اے (کیمبرج) پی۔ ایچ۔ ڈی (میونک) "بیرسٹر لا" بن کر واپس تشریف لے آئے۔

تجسس

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے جو نظمیں اور غزلیں لکھیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بانگ درا سے معلوم ہوتا ہے کہ

تین ساڑھے تین سال کی مدت میں انھوں نے چھوٹی بڑی کل چوبیس نظمیں اور چند غزلیں کہیں۔ یہ بھی کچھ اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ شیخ عبدالقادر کی تحریک پر لکھی گئیں جو مخزن کے لیے آئے دن نظموں کا مطالبہ کرتے رہتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے تمام تر اوقات حصولِ علم و فن کے لئے صرف کر رہے تھے اور مشغلۂ شعر کو معرضِ التوا میں ڈال رکھا تھا ان نظموں اور غزلوں سے جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک لکھی گئیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں تجسس و تفحص نے بعض الجھنیں پیدا کر دی ہیں جن کو سلجھانے کے لیے وہ بار بار حسن و عشق کے سائے میں پناہ لے رہا ہے لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں بعض ایسے سوالات ابھر رہے ہیں جن کا جواب اس کو نہیں ملتا: "محبت"، "حقیقتِ حسن"، "حسن و عشق"، "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر"، "وصال"، "سلیمی"، "حسن" وغیرہ خالص حسن انسانی اور جذبات عشق پر مبنی نظمیں ہیں، "اخترِ صبح"، "کلی"، "چاند تارے"، "ایک شام" حسن فطرت سے متعلق ہیں لیکن بعض نظموں میں انسان کی بیچارگی اور تحیر کا احساس واضح ہے مثلاً "انسان" (قدرت کا عجیب یہ ستم ہے)، "فراق" لیکن سب سے زیادہ نمایاں تغیر یہ نظر آتا ہے کہ وطن پرستی اور قوم پسندی کے وہ جذبات و خیالات جو یورپ جانے سے پیشتر شاعر کے دل و دماغ پر حاوی تھے ان کی گرفت بے حد نرم پڑ چکی تھی۔

وطنیت سے نفرت وطن سے باہر جا کر اقبال کو یہ احساس ہوا کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں کیونکہ مغرب کی جن قوموں نے اس اصول زندگی کو اختیار کیا ہے، وہ انتہا درجے کی خود غرض ہو گئی ہیں

ملک گیری اور استحصال کی حرص و آز نے ان کو بلند اخلاق انسانی سے محروم کر دیا ہے۔ اگر قوم پرستی اسی غرض پرستی اور لوٹ کھسوٹ کا نام ہے تو یہ کسی آبرومند قوم کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں جب اقبال نے دنیائے اسلام کے جمود، مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیمات اسلامی کی کسمپرسی کو دیکھا تو انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات سے رجوع کر کے اپنا مسلک یہ قرار دیا کہ ملتِ اسلامی کو بیدار کیا جائے، اس کو اقدار و اخلاقِ اسلامی سے از سرِ نو آشنا بنایا جائے اور اس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر حرم کا رستہ دکھایا جائے۔ ان کو صاف نظر آ گیا کہ مغربی تہذیب و ترقی کی بنیاد اخلاقِ عالیہ کی چٹان پر نہیں بلکہ زر پرستی کی ریت پر ہے اس لئے یہ عمارت مستقبل قریب میں پیوند خاک ہونیوالی ہے، چنانچہ "زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا" والی نظم میں انھوں نے واشگاف طور پر اپنے خیال کو ظاہر بھی کر دیا۔

قومیت اسلامی

اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے لیے اخلاقِ عالیہ کی بنیاد تلاش کرتے۔ چونکہ انھوں نے بزرگانِ اسلام کے زیرِ نظر پرورش پائی تھی اور دینِ اسلام کے معارف و حقائق ان پر آئینہ تھے اس لیے انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے پاس آبرومندانہ زندگی کے لیے نہایت سنگین و مستحکم بنیاد موجود ہے جس پر تہذیب، ترقی اور سربلندی کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے فرمایا کہ یورپ میں میں جس انداز کی نظمیں کہتا تھا، اگر اسی انداز پر قائم رہتا تو کبھی کا نوبل پرائز پا چکا ہوتا لیکن میں نے تہذیبِ مغربی کی کیفیت اور ملتِ اسلامیہ کی حالت

کو دیکھ کر یہی فیصلہ کیا کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ہر ایسے مسلمان کو جسے قدرت سے کوئی استعداد ودیعت ہوئی ہے، چاہیے کہ اپنی پوری طاقت مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی بزرگ داشت کے لئے وقف کر دے۔ یہ ہزار نوبل انعامات سے بہتر ہے۔

اس دور کی نظموں میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام" اور "عبدالقادر کے نام" جو نظمیں لکھی گئیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمت کا جذبہ اقبال کے قلب میں قیامت برپا کر رہا تھا۔ "صقلیہ" میں درد و سوز کی جو کیفیت ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس کی عظیم الشان تاریخ یاد دلا کر بیدار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ اب "ہمالہ"، "نیا شوالہ"، "ترانۂ ہندی"، "میرا وطن وہی ہے"، کا دور گزر چکا تھا، ملکی ترانے کی لے غائب ہو چکی تھی اور اقبال اپنے لئے ایک نیا راستہ تجویز کر چکا تھا۔

دوسرا باب

اقبال زندگی کی شاہراہ پر

پہلی فصل

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک

"ایم. اے. پی. ایچ. ڈی. بیرسٹرایٹ لا"

مراجعت
اقبال انگلستان سے واپس آکر بمبئی، دہلی اور انبالے میں احباب سے ملتے ملاتے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ دوپہر کی ٹرین سے لاہور پہنچے۔ ریلوے سٹیشن پر ہر مذہب و ملت کے معززین اور اقبال کے احباب کثرت سے موجود تھے جنھوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ یہاں سے احباب انھیں بھاٹی دروازے لے گئے۔ جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے دعوتِ چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیخ گلاب دین وکیل سب دوستوں کی طرف سے اہتمام پر مامور تھے۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر اسی دن سیالکوٹ روانہ ہو گئے تاکہ بزرگوں اور عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن کریں جو تین سال سے ان کے لئے چشم براہ تھے۔

پیشۂ وکالت
تین چار روز کے بعد علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آکر مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ملے اور علامہ کے لئے دفتر کرائے پر لینے کا کام ان کے سپرد کیا، چنانچہ موہن لال

پر گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے پاس علامہ کے لئے ایک مکان کرائے پر لے لیا گیا۔ موہن لال روڈ کو آج کل اردو بازار کہتے ہیں۔ یہ مکان مطبع مفید عام کے بالکل سامنے واقع ہے اور آجکل اس میں سٹیشنری کی دکان ہے۔ قانونی کتابوں کی لائبریری کا انتظام بھی کیا گیا اور منشی طاہر الدین مرحوم علامہ کے منشی مقرر کئے گئے۔ علامہ کے احباب کا منشا یہ تھا کہ وہ عدالت ہائے ضلع میں پریکٹس کریں اور اسی وجہ سے انھوں نے کچہری کے قریب دفتر کا بندوبست کیا تھا لیکن مرزا صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اس دفتر میں صرف دو تین ماہ رہے کیونکہ وہ ضلع میں پریکٹس کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چونکہ انھوں نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لہذا چیف کورٹ کے قرب کی وجہ سے انار کلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر لے لیا جس میں سر محمد شفیع مدت تک رہ چکے تھے اور جو ایک مشہور وکیل کی وجہ سے خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ اس مکان میں علامہ ۲۰۹۰۸ تک مقیم رہے۔ اسی میں ان کی سکونت رہی اور اسی میں دفتر تھا بلکہ منشی طاہر الدین بھی اسی مکان کے عقبی حصے میں رہنے لگے۔ مدت ہوئی یہ مکان منہدم کر دیا گیا اور اب اس کی جگہ وہ عمارت کھڑی ہے جسکو نیو مارکیٹ کہتے ہیں۔

وکالت کی طالب علم

لاہور ہائی کورٹ کے دفتر میں دوسرے وکلا کے ساتھ حضرت علامہ کا ذاتی فائل بھی محفوظ تھا جو قواعد کے بموجب اب تک معرض تلف میں آجانا چاہیے تھا لیکن علامہ کی جلالت قدر اور اس کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر اس کو محفوظ رکھا گیا۔ میاں محمد خلیل سابق رجسٹرار ہائی کورٹ اس کے لیے مستحق تحسین

ہیں۔ پچھلے دنوں ہائی کورٹ کے ایک افسر سید محسن ترمذی ایم اے۔ ایل ایل۔ ایم نے اس نوائی کے ضروری حصے ایک مضمون کی صورت میں شائع کیے جن سے معلوم ہوا کہ:

۱۸۹۸ء میں شیخ محمد اقبال نے لاہور لاء سکول (جو بعد میں کالج کہلایا) میں داخل ہو کر ایک متعلم قانون کی حیثیت سے لیکچروں کا کورس پورا کیا اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں قانون کے امتحان ابتدائی (P. E. L.) میں بطور امیدوار بیٹھے لیکن اصول قانون کے پرچے میں فیل ہو گئے۔

پھر جون ۱۹۰۰ء میں انھوں نے چیف کورٹ میں ایک درخواست پیش کی کہ انھیں دسمبر ۱۹۰۰ء کے امتحان پی۔ ای۔ ایل میں دوبارہ بیٹھنے کی اجازت عطا فرمائی جائے اور دوبارہ لیکچروں میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مسٹر جسٹس چیٹرجی نے یہ درخواست حسب قواعد "نامنظور کر دی۔

اسی نامنظوری سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ فیصلہ کیا کہ قانون کی تعلیم انگلستان جا کر حاصل کریں۔ اگر مسٹر جسٹس چیٹرجی اس درخواست کو منظور کر لیتے تو اقبال اسی زمانے میں کسی قصبے کی عدالت یا ضلع میں وکالت شروع کر دیتے اور اس تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے جو انھیں انگلستان اور جرمنی کے اکابر علم کی صحبت سے نصیب ہوئی۔

پروفیسری اور بیرسٹری

۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام وکلا کی فہرست میں درج کر لیا جائے اور مجھے ایڈووکیٹ چیف کورٹ قرار دیا جائے۔ چنانچہ درخواست

منظور کر لی گئی اور اقبال چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔

انھیں دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ مسٹر جیمز کا دفعتاً انتقال ہو گیا، مسٹر رابسن پرنسپل تھے۔ فوری طور پر کسی انگریز پروفیسر کا بندوبست ہو نہ سکتا تھا اور بہترین ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ہی ہو سکتے تھے اس لئے پرنسپل کی گزارش پر حکومت پنجاب نے علامہ اقبال سے استدعا کی کہ عارضی طور پر فلسفے کی پروفیسری قبول کر لیں تاکہ کالج کے سلسلہ تعلیمات میں خلل نہ پڑنے پائے۔ گرمی کا موسم تھا، علامہ کے پیریڈ کالج میں چھ بجے صبح سے ۹ تک قرار پائے، علامہ اقبال اور مسٹر گاڈلے، انڈر سیکرٹری تعلیمات حکومت پنجاب دونوں نے چیف کورٹ کے حکام اعلیٰ کو لکھا کہ علامہ کے مقدمات ہمیشہ اس وقت لیے جائیں جب وہ کالج سے فارغ ہو کر آجائیں، چیف جسٹس اور دوسرے ججوں نے اس کو منظور کر لیا اور علامہ بہ یک وقت پروفیسر اور بیرسٹر کی حیثیتوں سے کام کرنے لگے۔

کالج سے یہ تعلق بلاشبہ قانوناً عارضی تھا لیکن کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا آخر حضرت علامہ نے اس سے خود استعفیٰ دیدیا اور اپنے دوستوں اور ملازموں کے استفسار پر یہ فرمایا کہ اب میں سرکاری ملازمت نہیں کر سکتا تاکہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بے تکلف کہہ سکوں۔

اولین احباب

علامہ نے ایک گگ (چھوٹی بگھی) لے لی تھی، اسی میں کچہری جایا کرتے۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کے لئے ایک پوربیا سائیس ملازم تھا۔ اس زمانے میں مرزا جلال الدین صاحب

کے علاوہ علامہ کے تعلقات نواب ذوالفقار علی، سر جگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ سے بہت گہرے ہوگئے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اکثر کچہری سے فارغ ہوکر اپنی گگ بھیجدیتے اور میری کار میں بیٹھ کر میرے دفتر میں آجاتے، شام وہیں گزارتے اور رات کے گیارہ بارہ بجے واپس جاتے بعض اوقات رات بھر میرے پاس ہی رہتے اور صبح نماز، تلاوت قرآن اور ناشتے کے بعد گھر جاتے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا ایک رشتہ دار ظہور، میرا بیرا تھا جسے ستار بجانے کا کمال حاصل تھا۔ علامہ اکثر اس سے ستار سنتے بلکہ کچھ مدت تک اس سے ستار بجانا سیکھتے بھی رہے۔ جب نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ تعلقات بڑھے تو ایک خاصی مدت تک میں اور علامہ روزانہ شام کی چائے نواب صاحب ہی کے یہاں پیتے بلکہ جس دن کچہری میں تعطیل ہوتی ہم دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے۔

اس وقت تک سر محمد شفیع مسلمانوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے اور عام طور پر جلسوں کی صدارت وہی کیا کرتے تھے۔ مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ، مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ اور خواجہ کمال الدین علامہ اقبال کے دوست اور مداح تھے اور ان کو مسلمانوں کی قیادت کا حقدار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے علامہ کا نام ایک جلسے کی صدارت کے لئے تجویز کیا لیکن علامہ نے اپنی جگہ نواب ذوالفقار علی خاں کو صدر بنانے کی حمایت کی، چنانچہ اس کے بعد احمدیہ بلڈنگ اور اسلامیہ کالج کے میدان میں منعقد جلسے نواب صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئے۔ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی

خان قیادت کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ جب نواب پارے بیگم کے ماتحت پنجاب میں کونسل قائم ہوئی تو بعض بزرگوں کی مصالحت کوشی سے یہ قرار پایا کہ پہلی مرتبہ سر محمد شفیع ممبر منتخب کئے جائیں اور دوسری مرتبہ نواب صاحب کو موقع دیا جائے۔ چنانچہ سر محمد شفیع ممبر بن گئے اور نواب ذوالفقار علی خاں کو مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ سر جگیندر سنگھ پٹیالے ہی میں ہوم منسٹر مقرر ہوئے۔ یہ دونوں دوست تین سال تک پٹیالے میں رہے یہ ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ نواب صاحب کی وجہ سے اکابر پٹیالہ بھی علامہ اقبال کے گرویدہ ہو گئے تھے اور علامہ اور مرزا جلال الدین اکثر پٹیالہ جایا کرتے تھے۔

دوسری شادی چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی مطمئن نہ تھے اور موافقت و مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اس لئے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریہ گرلز سکول میں پڑھتی تھی۔ جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین، میاں شاہ نواز بیرسٹر، مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر سسرال میں پہنچے اور وہاں علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا، رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔

رخصتی کا التوا نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گم نام خطوط پہنچے

جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نامناسب شکایت لکھی تھیں، علامہ سخت مخمصے میں پڑ گئے، دوستوں سے ذکر کیا، انھوں نے چھان بین کا وعدہ کیا۔ ان حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہو گیا۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے، ایک بیوی سے ان بن ہو گئی، دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے۔ اس اثنا میں علامہ کے ایک دوست سید بشیر حیدر جو اس زمانے میں ایکسائز انسپکٹر لدھیانہ تھے، لدھیانے کے ایک مشہور دولتمند خاندان "نو لکھا" کے متعلق رشتے کا

لدھیانے میں تیسری شادی

پیغام لے کر آئے۔ اس خاندان کی یہ کیفیت ہے کہ جالندھر کے ایک صاحب ڈاکٹر سبحان علی نے یو۔ پی میں کاروبار سے بڑی دولت کمائی۔ ایک موقع پر ان کی دولت اور جائداد کا حساب لگایا گیا تو نو لاکھ کی مالیت تجویز ہوئی۔ چنانچہ وہ سبحان علی نو لکھے مشہور ہو گئے۔ انھوں نے لدھیانے میں شادی کی جس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کا شوہر بھی ڈاکٹر تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ فوت ہو گیا اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گیا۔ یہ بچے ڈاکٹر سبحان علی ہی کے ساتھ رہے اور انھیں کے خاندان میں شامل سمجھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر سبحان علی کے انتقال کے بعد یہ لڑکا جس کا نام غلام محمد تھا، بڑا ہونے کی وجہ سے تمام امورِ خاندانی کا ذمہ دار اور مختار ہو گیا۔ سید بشیر حیدر جو پیغام لائے تھے، وہ غلام محمد کی بہن یعنی ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی لڑکی کے متعلق تھا۔ جب رشتہ طے ہو گیا تو لاہور سے علامہ کی برات لدھیانہ گئی جس میں دوسرے احباب کے علاوہ شیخ عطا محمد، مرزا جلال الدین، چودھری

شہاب الدین، شیخ گلاب دین اور مولوی احمد دین بھی شامل تھے۔ لدھیانہ اسٹیشن پر برات کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سکولوں کے بچوں نے علامہ کی نظمیں گا کر سنائیں، برات کی خاطر مدارات اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی بلکہ میزبان نے لدھیانہ کے بازاروں میں کہلا بھیجا تھا کہ براتی بازار سے جو چیز خریدیں اس کا بل براتیوں سے نہیں بلکہ ہم سے وصول کیا جائے۔ نکاح کے بعد براتی واپس آ گئے لیکن علامہ وہیں رہ گئے۔

لاہور والی بیگم کا دامن پاک

چند روز بعد یہ خاتون لاہور آ گئیں اور اس موقع پر علامہ کی پہلی بیگم (گجرات والی) بھی یہاں پہنچ گئیں اور دونوں انار کلی والے مکان میں علامہ کے ساتھ رہنے لگیں۔ موچی دروازے والی بیگم کا معاملہ معلق ہی رہا لیکن کچھ مدت کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے:

۱۔ وکٹوریہ گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت طباعی اور نیکی کو بہت سراہا۔

۲۔ علامہ کے والد محترم نے جو بے حد پرہیزگار اور مقدس بزرگ تھے، استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاک دامن ہے۔

۳۔ مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گمنام خطوط لکھنے کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرسٹر لڑکے

سے ہو جائے۔

۴۔ جب یہ انکشافات ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بے حد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا اور ساتھ ہی لکھ دیا "میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے، اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روزِ قیامت آپکی دامن گیر ہونگی۔"

نکاح از سرِ نو کیا آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انھیں شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لئے مبادہ شرعاً طلاق ہو چکی ہو۔ انھوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی، لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہو تو دوبارہ نکاح کر لیجئے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا اور علامہ اس کو ساتھ لے کر سیالکوٹ چلے گئے۔ آٹھ دس دن کے بعد واپس آئے تو بڑی گرم جوشی کے ساتھ مرزا صاحب سے ملے اور فرمایا "اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپکو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں۔" مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس خاتون سے (جو جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں) شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ ۱۹۱۳ کا واقعہ ہے، اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اسلوب بالکل بدل گیا۔

"رنگ رلیوں" کا ذکر آگیا تو یہ بھی سن لیجیے کہ اقبال عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے، شہد کی مکھی نہ بنے لیکن آج بھی ان کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تمام ہم نشین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ علاوہ بریں مثنوی "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "در حضور رحمۃ اللعالمین" میں عرض کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشقِ مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو۔ فرماتے ہیں:

عشق با مرغولہ مویاں باختم　　مدتے با لالہ رویاں ساختم
بر چراغِ عافیت داماں زدم　　بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
رہزناں بردند کالائے دلم　　برقہا گرد بد گرد حاصلم
ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سارا ز داما نم نہ ریخت

سسرال سے کوٹھی کی پیش کش

ایک دفعہ علامہ کے لدھیانے والے برادر نسبتی غلام محمد نے کہا کہ اقبال ایک کوٹھی خرید لیں، روپیہ ہم دیدیں گے۔ علامہ اس شرط پر تیار ہو گئے کہ وہ اس روپے کو بالاقساط واپس لے لیں، چنانچہ کوپنز روڈ پر دصنیت رائے کی ایک پرانی کوٹھی کا سودا طے ہو گیا، پانچ سو روپے بیعانہ قرار پایا۔ علامہ نے لدھیانے

خط لکھا۔ غلام محمد روپیہ لے کر آگیا۔ اس وقت علامہ کی لدھیانے والی بیگم زندہ تھیں۔ علامہ نے مرزا جلال الدین کو غلام محمد کے ساتھ بھیجا کہ مالک مکان سے معاملہ طے کر آئیں۔ اتنے میں غلام محمد نے مرزا صاحب سے کہا کہ بیعانے کی رسید میری بہن کے نام لکھی جائے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ علامہ نے مجھے ایسی کوئی بات نہ بتائی تھی اس لیے میں متشوش ہو گیا لیکن جب مالک مکان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور صاحب کے ساتھ کوٹھی کا سودا کر چکا ہے۔ جب میں نے واپس آکر علامہ کو یہ قصہ سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ اچھا ہوا۔ یہ سودا نہ ہوا ورنہ مجھے اپنی بیوی کے مکان میں رہنا پڑتا۔

نکاح کے پیغامات

ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کی بیٹی علامہ اقبال کیساتھ شادی کرنے کی بیحد خواہشمند تھی وہ کہا کرتی تھی کہ مجھے ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں سے زیادہ انس ہے۔

علامہ سے شادی کرنے کے سلسلے میں بہت خطوط آیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب ایک واقعہ سناتے ہیں: کرنال کے ایک مولوی صاحب نے علامہ کو پیہم خطوط لکھے کہ ایک نہایت اچھی پڑھی لکھی خاتون جو مذہب کی پابند ہے، آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ علامہ نے مولوی صاحب کو خط لکھوایا کہ ایسے خط نہ لکھا کرو لیکن مولوی صاحب پھر بھی باز نہ آئے اور لکھتے رہے: "اگر رد کرو گے تو ظلم کرو گے۔ تم اس خاتون کو ایک بار دیکھ تو لو۔"

وہ خاتون اپنے بھائی کے ساتھ مرزا صاحب کے مکان پر آئی۔ انھوں نے علامہ اور نواب ذوالفقار علی خاں کو بلا بھیجا۔ سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔

علامہ اور نواب صاحب کھانا کھا کر چلے گئے، دوسرے روز اس خاتون کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا گیا!

ذہنی کشمکش دوسری شادی سے پہلے بزرگانِ خاندان کوشش کر رہے تھے کہ پہلی بیگم سے موافقت ہو جائے لیکن اقبال انتہائی ذہنی کرب میں مبتلا تھے جس کا پتا اس چھٹی سے چلتا ہے جو انھوں نے اپریل ۱۹۰۹ء میں عطیہ بیگم کو لکھی۔ عطیہ نے ملامت کی تھی کہ آپ کو علی گڑھ کالج کی طرف سے فلسفے کی پروفیسری پیش کی گئی تو آپ نے اس کو مسترد کیوں کر دیا! علامہ اس چھٹی میں لکھتے ہیں کہ ہاں میں نے علی گڑھ کی پروفیسری مسترد کر دی اور اس سے پہلے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی پیش کش کو بھی رد کر چکا ہوں جس میں مجھے تاریخ کی پروفیسری پیش کی گئی تھی:

میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا، میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس ملک سے بھاگ جاؤں۔ اس کی وجہ تم کو معلوم ہے مجھے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بے حد زیر بار ہوں، میری زندگی نہایت مصیبت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی میرے سر چپکنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والدِ محترم کو لکھ دیا ہے کہ انھیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق نہ تھا خصوصاً جس حالت میں میں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ میں بیوی کو نان و نفقہ دینے پر آمادہ ہوں لیکن میں اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے

۱۔ گذشتہ چند صفحوں کے مندرجات زیادہ تر مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں کے بیانات پر مبنی ہیں!

کے لیے تیار نہیں۔ ایک انسان کی حیثیت سے مجھے مسرت کے حصول کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت میرے اس حق سے انکار کریں گے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کروں گا۔ میرے لئے صرف ایک ہی چارہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دوں یا مے خواری میں پناہ ڈھونڈوں جس سے خودکشی آسان ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے یہ مردہ، بے جان اور بنجر اوراق مسرت نہیں دے سکتے اور میری روح کے اعماق میں اس قدر آگ بھری ہوئی ہے کہ میں ان کتابوں کو اور ان کے ساتھ ہی معاشری رسوم و روایات کو بھی جلا کر خاکستر بنا سکتا ہوں

(۹ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم نے تسلی اور ہمدردی کا خط لکھا اور مشورہ دیا کہ تم شیخ عبدالقادر سے بات کرو اس پر علامہ نے لکھا:

میں عبدالقادر سے روز ملتا ہوں اور چیف کورٹ کے بار روم میں تو ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی ہے لیکن ہم دونوں کے درمیان مدت دراز سے تمہارا ذکر نہیں آیا اور حقیقت یہ ہے کہ اب تو میں دوسروں سے بہت ہی کم بات چیت کرتا ہوں۔ میرا بدبخت نفس خود ہی ایسے مصیبت ناک خیالات کا معدن بنا ہوا ہے جو میری روح کے تاریک و تار گوشوں سے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں عنقریب آوارہ بن کر گلیوں میں گھوما کروں گا اور میرے پیچھے پیچھے لونڈوں کا ایک گروہ تماشا دیکھنے کے لئے چلا کرے گا۔ مجھے تم

یاس پرست نہ سمجھو، سچ یہ ہے کہ غم بجائے خود لذیذ شے ہے، میں اپنی بدقسمتی سے لطف اٹھا رہا ہوں اور ان لوگوں پر قہقہہ لگاتا ہوں جو اپنے آپ کو خوش و خرم سمجھتے ہیں۔ دیکھا! میں اپنی مسرت کو کس طرح چھپاتا ہوں۔ (۱۷ اپریل ۱۹۰۹)

عطیہ بیگم علامہ کو جنجیرہ آنے کی دعوت دیتی ہیں اور نواب صاحب اور بیگم صاحبہ جنجیرہ کے شوقِ ملاقات کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ علامہ وعدہ کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آئیں گے لیکن ٹرین کے سفر کے بعد ایک جہاز پھر کشتیوں اور پھر تانگوں پر منزل طے کرنے اور بعض خلیجیں اور گھاٹیاں عبور کرنے کی مصیبت کو ہفت خواں بھی بتاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ چند روز کیلئے حیدر آباد دکن جاکر لاہور واپس آجاتے ہیں تو عطیہ بیگم ان کو نہایت غصہ آلود خط لکھتی ہیں کہ تم حیدر آباد دکن تک آئے اور جنجیرہ نہ پہنچے اور معلوم ہوتا ہے کہ تم حیدر آباد میں نوکری کرنا چاہتے ہو حالانکہ ہندوستان کے کسی والیٔ ریاست کے ہاں نوکر ہونا تمہاری تمام صلاحیتوں کو سلب کر دیگا۔ اس کے جواب میں علامہ عطیہ بیگم کو لمبے لمبے خط لکھ کر اپنی فروگزاشت پر ان سے اور نواب بیگم جنجیرہ سے معذرت خواہ ہوتے ہیں کہ رخصت بہت محدود تھی اور مجھے فوراً لاہور پہنچنا تھا اور اب اس فروگزاشت کی تلافی کسی اور موقع پر کروں گا اور رہا حیدر آباد میں ملازمت کا سوال تو میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ تمہارے خطوط سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میری مصیبتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو

اور میں سمجھانا بھی فضول سمجھتا ہوں کیونکہ تم میری باتوں کا یقین کرنے سے انکار کرتی ہو :

بیشک ہر انسان اپنی آرام گاہ تک پہنچنے کا صابرانہ انتظار کرتا ہے ، میں جلد سے جلد اس مقام کو جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے خالق سے یہ مطالبہ کروں کہ وہ میرے ذہن کی عقلی توجیہ و تشریح کرے اور یقین جانو کہ یہ کام اس کے لئے بھی آسان نہ ہوگا تم مجھے نہ سمجھنے کی شکایت نہ کرو ، خود میں بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ مدت ہوئی میں نے لکھا تھا :

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

آگے چل کر لکھتے ہیں :

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہیں اس بات کا رنج ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ میرا کما حقہ احترام و اعتراف نہیں کرتے لیکن تم اس بات کی پروا نہ کرو۔ میں دوسروں کی باتوں پر زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا :

جذبہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

میں نہایت سیدھی سادی دیانت دارانہ زندگی بسر کرتا ہوں ، میرے دل اور زبان کے درمیان پوری موافقت ہے ، لوگ منافقت کی مدح و ثنا کرتے ہیں ، اگر شہرت ، عزت اور مدح و ثنا حاصل کرنے کے لئے مجھے منافقت اختیار کرنی پڑے تو میں گمنام اور کس مپرسی رہنا ہزار درجے زیادہ پسند

کروں گا، عوام کو جن کی گردنوں پر راون کی طرح دس سر ہیں، ان لوگوں کا احترام کرنے دو، جو مذہب اور اخلاق کے متعلق عوام کے جھوٹے اور بے بنیاد نصب العینوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں ان کے رسوم و روایات کے آگے سر جھکانے اور ذہنِ انسانی کی آزادی کو دبانے سے بالکل قاصر ہوں۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کے معاصرین ان کی عزت نہیں کرتے تھے، اگرچہ میں ان کے مقابلے میں قوتِ شعری کے اعتبار سے کم تر ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ کم از کم اس معاملہ میں تو ان کا ہم سر ضرور ہوں۔ (۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء)

ایک مثنوی کی داغ بیل

جولائی ۱۹۱۱ء میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں:

گزشتہ پانچ چھ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی ہو رہی ہیں اور پبلک کو ان کے پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض نظمیں تو میں نے خود ہی تلف کر دی ہیں تاکہ مبادا کوئی ان کو چرا کر شائع کر دے۔ بہر حال کچھ تردد کروں گا کہ بعض نظمیں محفوظ ہو جائیں۔ والد مکرم نے فرمائش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی پیروی میں ایک فارسی مثنوی لکھوں، اگرچہ یہ کام مشکل تھا لیکن میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار یہ ہیں:

نالہ را انداز نو ایجاد کن / بزم را از ہاو ہو آباد کن

آتش استی بزمِ عالم بر فروز / دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز

سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز / اشک خونیں را جگر پر کالہ ساز

پشت پا بر شورشِ دنیا بزن / موجہ بیرون ایں دریا بزن

باقی اشعار بھول رہا ہوں۔ امید ہے کچہری سے واپس آنے پر یاد کر سکوں گا۔ ایک غزل بھیجتا ہوں جو پچھلے دنوں رسالہ "ادیب" میں چھپی ہے۔ شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی مس گوسٹیمن نے شالامار باغ کے ایک تختۂ گل سے ایک نہایت خوبصورت پھول مجھے پیش کیا تھا۔ اس پر میں نے چند اشعار لکھے تھے (بانگ درا پھول کا تحفہ عطا ہونے پر۔ مؤلف) میرے دوست سردار امراؤ سنگھ نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے سردار صاحب کو لکھا ہے کہ وہ ترجمہ بھیجدیں۔ اصل نظم بھی غالباً میرے پاس نہیں، بہرحال تلاش کر کے تمہیں بھیجدوں گا![1]

کشمیریوں کے لئے فوجی ملازمت اور زراعت پیشہ

۱۹۰۹ء میں علامہ اقبال انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے جنرل سکرٹری مقرر ہوئے۔ منشی محمد دین فوق کے رسالے "کشمیری میگزین" میں انجمن کشمیری مسلمانان کے جلسوں کی روئیدادیں اور دوسری تحریریں درج ہوتی تھیں۔ اس رسالہ میں علامہ کی طرف سے کشمیریوں کے نام دو گشتی چٹھیاں شائع ہوئی تھیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ "کشمیریوں کے مربی اور محسن نواب آنریبل سر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں کے سی۔ ایس۔ آئی نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء وائسریگل کونسل میں کشمیری قوم کی فوجی ملازمت اور زمینداری کے متعلق سوالات پیش کئے تھے فوج کے متعلق لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند نے یہ جواب دیا کہ کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگرچہ

۱۔ اقبال کے خطوط بنام عطیہ بیگم، جولائی ۱۱ء

کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ نہیں ہے۔ کشمیریوں کو زراعت پیشہ قوم قرار دینے کے متعلق یہ جواب دیا گیا کہ صوبے کی حکومت جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے، زمینداری اقوام بندی میں شامل کر لیتی ہے۔ یہ دونوں سوال جواب وائسرائے نے حکومت پنجاب کو بھیج دیئے ہیں اور حکومت پنجاب اپنے کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ذریعے سے اعداد و شمار فراہم کرا رہی ہے کہ ہر ضلع میں کتنے کشمیریوں کی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت ہے۔ اس گشتی چٹھی میں علامہ نے قومی کارکنوں سے اپیل کی تھی کہ ان اعداد و شمار کی فراہمی میں حکام سے تعاون کریں تاکہ حصولِ مقصد میں آسانی ہو۔ کشمیریوں کی مردم شماری کے متعلق بھی تحریک کی گئی کہ ہر مقام کے کارکن کشمیری مسلمانوں کی فہرستیں تیار کریں!

اکتوبر ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں "رباعیات اقبال" کے عنوان سے آٹھ رباعیاں مسلمانانِ کشمیر کے متعلق درج ہیں۔ مثال کے طور پر دو رباعیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
درِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ "کشمیر"

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور

ا۔ کشمیری میگزین مئی ۱۹۰۹ء و جون ۱۹۰۹ء

ہندوستاں میں آتے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیری میگزین ماہ اپریل ۱۹۰۹ء میں اقبال کی وہ نظم تمام وکمال درج ہے جو انھوں نے فروری ۱۸۹۶ء میں مجلس کشمیری مسلمانان لاہور کے جلسے میں پڑھی تھی اور جس کا ذکر کسی اور فصل میں کیا جا چکا ہے، اس وقت علامہ بی اے کے طالب علم تھے۔ کشمیری میگزین ماہ اپریل ۱۹۰۹ء میں "حالاتِ اقبال" کے عنوان سے علامہ کے مفصل حالاتِ زندگی درج ہیں اور ان کے علمی و شعری کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

انجمن کے جھگڑوں میں ثالثی

۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے چند چھوٹی چھوٹی نظمیں تو لکھیں جو پیسہ اخبار اور مخزن میں شائع ہوتی رہیں لیکن انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں کوئی نظم نہ پڑھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ پیسہ اخبار مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مولوی محبوب عالم، میاں فضل حسین، چودھری نبی بخش، مولوی فضل الدین، میاں نظام الدین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے اور بحث مباحثے کے بعد ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ سات اصحاب کا ایک بورڈ مقرر کیا جائے جس میں ایک طرف سے شیخ اصغر علی، مولوی رحیم بخش اور میاں فضل حسین اور دوسری طرف سے میاں

محمد شفیع، نواب ذوالفقار علی خاں اور ڈاکٹر محمد اقبال شامل ہوں اور ان کے صدر نواب فتح علی خاں قزلباش مقرر کیے جائیں۔[۱]

اسی ثالثی بورڈ نے اپنا فیصلہ دیدیا۔ اس پر مولوی انشا اللہ نے انجمن کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لے لیے۔ ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء کو پیسہ اخبار میں فیصلہ ثالثی کا اعلان ہوگیا اور دعا کی گئی کہ اللہ اس فیصلے کو انجمن کے انتظامات کے لیے مبارک کرے۔

"شکوہ" انجمن میں

۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" ریواز ہوسٹل کے صحن میں پڑھی۔ اس وقت ان کے والدِ محترم بھی جلسے میں تشریف رکھتے تھے اور اس نظم کو سن کر برابر روتے رہے۔ چند ماہ بعد موچی دروازے کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ نے "جوابِ شکوہ" تحت اللفظ پڑھ کر سنائی، ترنم کے تقاضے پر سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھنا مناسب ہے۔[۲]

بمبا دلیپ سنگھ سے ملاقات

۱۹۱۱ء کا ذکر ہے، سردار جگندر سنگھ نے علامہ اقبال سے کہا کہ شہزادی بمبا دلیپ سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی) آپ سے ملاقات کی بےحد خواہشمند ہے۔ یہ شہزادی جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھی اور اس کا ڈرائیور پیر جی گھر کے تمام انتظامات کا نگراں تھا۔ ایک دن سردار جگندر سنگھ، مرزا جلال الدین، علامہ اقبال کو بمبا کی کوٹھی پر لے گئے۔ یہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا جس میں چلتے،

۱۔ پیسہ اخبار ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء ۲۔ پیسہ اخبار ۶ اگست ۱۹۱۰ء

کا انتظام ہوا۔ بمبا کی فرمائش پر علامہ نے ایک نظم سنائی، بمبا اردو تو سمجھ لیتی تھی لیکن شعر سمجھنے سے قاصر تھی۔ سردار جگندر سنگھ ترجمہ و تشریح کر کے سمجھاتے رہے۔

بمبا کو معلوم ہو گیا تھا کہ علامہ اقبال حقہ بہت پیتے ہیں، چنانچہ اس نے دعوت دینے سے پہلے اپنے ڈرائیور بیرجی سے کہ کر اعلیٰ درجے کا حقہ منگوایا۔ بیرجی نے اسے نہایت اہتمام سے تازہ کر کے اور چلم بھر کر برآمدہ میں رکھ دیا۔ بمبا خود گئی، برآمدے سے حقہ اٹھا لائی اور علامہ کے آگے رکھ دیا۔ علامہ بہت خوش ہوئے اور بولے: دیکھئے مرزا صاحب! ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے حقہ پلایا۔

مرزا جلال الدین فرماتے ہیں کہ ایک اور موقع پر بمبا کی ایک آسٹرین سہیلی آئی وہ بھی علامہ سے ملنے کی مشتاق تھی، ہمیں پھر چائے کی دعوت دی گئی۔ اس دفعہ جگندر سنگھ لاہور میں موجود نہ تھے، صرف میں اور علامہ گئے اور چائے پی کر واپس آ گئے ایک دفعہ بمبا نے شالامار میں چائے کا انتظام کیا، اس کی آسٹرین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی مدعو تھی۔ ایک نے علامہ کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا، دوسری نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی جو اس کی گود میں بیٹھی تھی۔ علامہ کی دو نظمیں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر" اسی موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں۔

شہزادی بمبا کو انگریزوں سے بڑی کد تھی، اس کے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز مجھے زہر دلوا دیں گے۔ بیمار ہوئی تو لاہور میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل ڈاکٹر مدر لینڈ سے علاج کرایا۔ میل جول بڑھا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ کچھ مدت بعد ڈاکٹر مدر لینڈ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، بمبا نے جیل روڈ والی کوٹھی

فروخت کر دی اور شوہر کے ساتھ انگلستان چلی گئی!

اقبال کو تبلیغ کیلئے جاپان بھیجو

۱۹۱۲ء میں علامہ اقبال نے متعدد نظمیں لکھیں جن میں سے "یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" اور ایک نعت "نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر" پیسہ اخبار میں شائع ہوئیں۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں مولوی ظفر علی خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ موسم گرما میں تعطیلات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو جاپان بھیجنا چاہیے تاکہ وہ وہاں تبلیغ اسلام کریں۔ مصارف کیلئے تجویز کی کہ علامہ کی نظم کی دس ہزار کاپیاں چھاپی جائیں اور آٹھ آنے فی کاپی کے حساب سے فروخت کر کے پانچ ہزار روپیہ فراہم کیا جائے جو علامہ کے مصارف سفر کے لئے کافی ہوگا۔ اس پر پیسہ اخبار نے لکھا کہ یہ تجویز محض جوش میں آکر پیش کر دی گئی ہے خود علامہ کا یہ خیال ہو کہ جب مولوی برکت اللہ (بھوپالی) تین سال جاپان میں رہ کر اخبار بھی نکالتے رہے اور دو تین سے زیادہ جاپانیوں کو مسلمان نہ بنا سکے تو میں دو مہینے میں کیا کر لوں گا۔ پیسہ اخبار نے لکھا کہ علامہ اس ملک ہی میں رہ کر اپنی قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں![2]

سلطان و فقیر

اس سال بھی انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی اسی موقع پر زیر صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خان ہوا۔ بے شمار اکابر و معززین جمع تھے۔ انجمن کے جلسے کا پہلا اجلاس مرزا سلطان احمد و زیر مال بہاولپور کی صدارت میں

۱۔ شہزادی بمبا کا یہ سارا ماجرا مرزا جلال الدین کے بیان سے ماخوذ ہے۔

۲۔ پیسہ اخبار ۸ مارچ ۱۹۱۲ء

اور اس کے بعد کا اجلاس فقیر سید افتخار الدین کی صدارت میں منعقد ہوا چونکہ اس اجلاس میں علامہ اقبال نظم پڑھنے والے تھے اس لئے چاروں طرف اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی علامہ نے اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" پڑھ کر سنائی جس نے ہزارہا کے مجمع کو ششدر و مبہوت رکھا۔ اس نظم سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے ہزاروں روپے چندہ انجمن کو دیا۔ چونکہ اس موقع پر انجمن کے اجلاسوں کی صدارت "سلطان احمد اور فقیر افتخار الدین" نے کی تھی اس لئے علامہ نے ایک قطعہ فی البدیہہ ارشاد فرمایا:

همنشین بی ریائم از رهِ اخلاص گفت ‌‌‌‌‌‌‌‌ اے کلام تو فروغ دیدهٔ برنا و پیر
درمیان انجمن معشوق ہرجائی مباش ‌‌‌‌‌‌‌‌ گاه با سلطان باشی گاه باشی با فقیر
گفتمش اے همنشیں معذور می دارم ترا ‌‌‌‌‌‌‌‌ در طلسم امتیاز ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمع عشق را در بزم دل افروختم
سوختم خود را و سامان دوئی ہم سوختم [۱]

مہاراجہ الور کی پرائیویٹ سیکرٹری شپ

ایک دفعہ علامہ ریاست الور بھی گئے تھے۔ انھوں نے خود یہ قصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو سنایا "ایک دن سر علی امام نے مجھ سے کہا کہ مہاراجہ الور کو ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے۔ اگر آپ وہاں نوکری کرنا چاہیں تو میں تقریب کرائے دیتا ہوں۔ آپ جا کر مہاراجہ سے ملاقات کر آیئے۔ چنانچہ میں منشی طاہر الدین اور علی بخش کو ساتھ لے کر الور پہنچ گیا۔ وہاں ہم

۱۔ پیسہ اخبار ۱۸/۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

مہمان خانہ شاہی میں ٹھہرائے گئے۔ دوسرے ہی دن صبح ایک مسلمان حجام ہماری خدمت کیلئے آیا۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال ہیں جو مسلمان کے بڑے مشہور شاعر اور رہنما ہیں۔ اس نے میری حجامت بناتے بناتے مجھ سے پوچھ لیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے بہت رک رک کر نہایت تامل سے کہا: صاحب! آپ یہاں نوکری نہ کریں تو اچھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا وجہ ہے؟ اس نے پھر تامل کر کے کہا: صاحب کچھ نہیں، ہم تو غریب رعایا ہیں، اپنے مہاراج کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن آپ کیلئے ضروری تو نہیں کہ یہاں کی نوکری کریں۔ جب میں نے اس سے باصرار وجہ پوچھی تو اس نے ہزار تامل کے بعد وہ ناگفتہ بہ باتیں سنائیں جو ان اطراف میں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔

علامہ مہاراجہ الور سے ملے، کچھ باتیں ہوئیں۔ اس گفتگو کے دوران علامہ کو معلوم ہوا کہ پرائیویٹ سیکریٹری کی تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوگی۔ علامہ نے جواب دیا کہ سوچ کر جواب دونگا۔ یہ کہہ کر واپس آئے اور چپ چاپ ریاست الور سے رخصت ہو کر لاہور پہنچ گئے۔

مسجد کانپور ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کی مسجد (کانپور) کا ہنگامہ برپا ہوا۔ مقامی حکام نے محض ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے مسجد کا وضو خانہ گرا دیا۔ اس پر مسلمان جوش میں بھر گئے۔ مظاہرہ ہوا، گولی چلی، گرفتاریاں ہوئیں، ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں جوش بھر گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کا پیسہ اخبار مظہر ہے کہ "علامہ اقبال اور مرزا جلال الدین ملزمین کانپور کی طرف سے مقدمہ لڑنے کے لئے کانپور تشریف لے گئے ہیں، زیادہ دنوں تک وہاں قیام نہ کریں گے"۔ (پیسہ اخبار ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

مولانا گرامی

۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس میں علامہ اقبال، مولانا گرامی اور نواب ذوالفقار علی خاں اکٹھے داخلِ اجلاس ہوئے. مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ گرامی اکابرِ شعرائے فارسی میں سے ہیں، آج گرامی کو سن لو، کل فخر کرو گے. تم نے گرامی کو سنا ہے. مولانا نے اپنا کلام سنایا. اسی اجلاس میں علامہ نے اپنا فلسفۂ خودی سادہ زبان اور سلیس انداز بیان میں پیش کیا اور مثنوی اسرارِ خودی کے چند اشعار بھی سنائے![1]

اسرارِ خودی کی اشاعت

۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس میں سوئے اتفاق سے انگریز، فرانسیسی اور روسی ایک طرف اور جرمن، آسٹریا اور ترک دوسری طرف صف آرا ہو گئے. مسلمانانِ ہند سخت مضطرب ہوئے کیونکہ ان کے حکمران خلافتِ عثمانیہ اسلامیہ سے برسرِ پیکار تھے. علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کی پروفیسری چھوڑ چکے تھے اور صرف چیف کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے. ان دنوں شفاء الملک فقیر محمد چشتی علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے. مثنوی اسرارِ خودی مکمل ہو چکی تھی. علامہ کو کتابت وطباعت کے خلجان سے کوئی سروکار نہ تھا. چنانچہ یہ کام حکیم صاحب کے سپرد ہوا جنھوں نے منشی فضل الٰہی مرغوب رقم سے جو علامہ اقبال کی نظموں کے مشہور کاتب تھے، مثنوی کی کاپی لکھوائی اور ۱۹۱۵ء میں چھپوا کر شائع کر دی.

انھیں دنوں علامہ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا، علامہ کئی روز تک بے حد غم زدہ وافسردہ رہے. راقم الحروف تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو دیر تک مرحومہ

---

۱. راقم جلسے میں حاضر تھا.

کی خوبیاں بیان کر کرکے آبدیدہ ہوتے رہے ۔ فرمانے لگے : جب میں سیالکوٹ جاتا تھا اور والدہ شگفتہ ہو کر فرماتی تھیں "میرا بالی آگیا" تو میں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک ننھا سا بچہ سمجھنے لگتا ۔ افسوس شباب میں یہ لمحۂ طفلی اب کبھی نصیب نہ ہوگا ۔

علامہ نے "والدہ محترمہ کی یاد میں" کے عنوان سے جدید انداز میں جو مرثیہ لکھا (بانگِ درا صفحہ ۲۵۲) ، وہ ان کی شاہ کار نظموں میں سے ہے اور شاید ہی دنیا کی زبانوں میں اس مرثیہ کی کوئی نظیر مل سکے جس لمحۂ طفلی کا ذکر ابھی آیا ، اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

علم کی سنجیدہ گفتاری ، بڑھاپے کا شعور	دنیوی اعزاز کی شوکت ، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم	صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں ، فکر سے آزاد ہیں	پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

مولانا اکبر نے قطعۂ تاریخِ وفات لکھا جو مرحومہ مغفورہ کی لوحِ مزار پر کندہ ہے :

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت	سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پر درد و غم	رحلتِ مخدومہ تاریخ وفات

۱۳۳۲

چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیرِ پر ہی رہے اس لئے کہ بیحد پر آشوب زمانہ تھا مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا ابو الکلام ، مولانا ظفر علی خان اور بیشمار دوسرے علم برداران اتحادِ اسلامی قید و بند میں تھے ۔ اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکامِ وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی اشد شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی مرتب نہ ہوتا بلکہ جب اواخرِ جنگ میں وائسرائے نے دہلی میں

وارکانفرنس وارکانفرنس منعقد کی تو بہ طور خاص نواب ذوالفقار علی خاں کی وساطت سے علامہ اقبال کو بھی طلب کیا اور اس موقع کیلئے ایک نظم کی فرمائش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھا جس کے کل نو بند ہیں۔

بطور نمونہ دو بند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں، یہ نظم یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی:

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند — روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند — تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر — بہ روز جنگ تو جگر سوز سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر — آزاد پر کشادہ پری زادیم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

مدینے کا کبوتر ۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینہ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا تھا اور اس کے دانے دنکے کی فکر بہ نفس نفیس کیا کرتے تھے۔ نومبر کی ۲۰ کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا۔ اس واقع سے اقبال بہت متاثر ہوئے اور ایک نظم لکھی، پہلا شعر یہ تھا:

۱۔ یہ پورا مسدس اخبار وکیل "امرتسر" مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء و "ستارہ صبح" مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء میں درج ہے

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر
آیا تھا اُڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تو[1]

حضورؐ بطور نقادِ شعر

ستارۂ صبح (کرم آباد) مورخہ ۸ اگست ۱۹۱۷ء میں علامہ نے ایک مختصر سا مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: رسول اللہ صلعم فنِ شعر کے مبصر کی حیثیت میں" اس مضمون میں آپ نے یہ حقیقت واضح کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا، وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ادبی نصب العین کے دلیلِ راہ رہیں گے۔ مثلاً حضور صلعم نے امراء القیس کے متعلق جو اسلام سے چالیس سال قبل ہوا ہے، ارشاد فرمایا: **ھو اشعر الشعرا وقائدھم الی النار** یعنی وہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے لیکن انھیں جہنم کی طرف لے جانے والا لیڈر بھی وہی ہے"۔ اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ حضور اعلیٰ درجے کی شاعری کے مرتبہ شناس بھی تھے اور امراء القیس کی شاعری کے موضوع کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کے کمالِ شاعرانہ کا اعتراف فرماتے ہیں، لیکن چونکہ اس شاعر کی حسین و جمیل شاعری سننے والوں کو حقائقِ حیات سے غافل کر کے ان میں بیخودی کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور مے و معشوق کی طرف رہبری کرتی ہے اس لیے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضور صلعم کو سنایا گیا:

۱۔ پوری نظم "ستارۂ صبح" ۲ نومبر ۱۹۱۷ء

ولقد ابیت علی الطوی واظله
حتی انال بہ کریم الماکل

یعنی: میں نے بہت سی راتیں محنت شاقہ میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔ حضور صلعم اس شعر کو سن کر بیحد محظوظ ہوئے اور صحابہ کرام رض سے فرمایا:

کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے کہنے والے کو دیکھنے کے لئے میرا دل بے اختیار رچاہتا ہے۔

یعنی چونکہ ایک صحیح اور قابلِ تعریف جذبہ فنی حسن وخوبی کے ساتھ نظم کیا گیا تھا لہٰذا حضور صلعم نے ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضور صلعم کے نزدیک آرٹ حیاتِ انسانی کا تابع ہے۔ جو آرٹ انسان کو کاہلی، جمود و عیاشی سے نفرت دلا کر محنت ومشقت اور اکل حلال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہی آرٹ قابلِ قدر ہے۔ اس مضمون میں علامہ اقبال نے صاف صاف آرٹ کا یہ نظریہ بیان کر دیا ہے کہ "فن برائے فن" لغویات ہے، "فن برائے زندگی" ہی بہترین نظریہ ہے۔

یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی واجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشہ گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔ غرض رسول اللہ صلعم

کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس
نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح
شان ارتقا کیا ہے!

اس زمانے میں مولوی ظفر علی خاں جب کبھی کرم آباد سے لاہور آکر علامہ کی صحبت سے مستفید ہوتے، واپس جاکر اس صحبت کا حال بہت مزے لے لے کر لکھتے اور "ستارۂ صبح" کے پڑھنے والوں کو بھی اس ادبی ضیافت طبع میں شریک کر لیتے۔

رموزِ بے خودی اپریل ۱۹۱۸ء میں "اسرارِ خودی" کا دوسرا حصہ مثنوی "رموزِ بے خودی" کے نام سے شائع ہوا جس میں اسرارِ حیاتِ ملیہ اسلامیہ بیان کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ فرد کی خوشی کس طرح ملت کی خودی میں گم ہو کر اجتماعی قوت کا باعث ہو جاتی ہے۔ اربابِ ذوقِ سلیم کو اسرارِ خودی کے مطالعے سے مزید حقائق کی جو تشنگی لاحق ہو گئی تھی، اس کو "رموزِ بے خودی" نے بہ وجہ احسن فرد کیا۲

گرامی لاہور میں ان دنوں مولانا غلام قادر گرامی۳ دو تین دفعہ ہوشیارپور سے لاہور میں وارد ہوئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ لاہور میں ہمیشہ ہی علامہ کے ہاں قیام فرماتے اور ایک دفعہ آجاتے تو ہفتوں یہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے۔ چونکہ شعر فارسی میں ان کا پایہ بہت بلند اور استادانہ تھا اس لیے حضرت علامہ بھی بعض اشعار میں ان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ ان دونوں باکمالوں میں

۱۔ "ستارۂ صبح" ۸ اگست ۱۹۱۷ء ۲۔ ریویو "ستارۂ صبح" ۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء
۳۔ مولانا گرامی کے حالات و لطائف راقم کی کتاب "سرگزشت" میں ملاحظہ ہوں۔

جو خلوص اور محبت کے تعلقات تھے ان کی مثالیں آج بالکل ناپید ہیں۔ اگر علامہ ان کے کمالات کے مدح خواں اور معترف تھے تو وہ بھی علامہ کے فدائی تھے اور ان کے منصب کو پہچانتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

جلسۂ فتح اور اقبال ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کیساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں جن کا کوئی تعلق جنگ یا فتح سے نہ تھا۔ ان میں سے ایک نظم "شعاع آفتاب" بانگ درا کے صفحہ ۲۶۷ پر درج ہے۔ فارسی کے چند اشعار بھی سنائے۔ چوں کہ راقم الحروف اس جلسہ میں موجود تھا اس لئے یہ اشعار درج ذیل ہیں۔ بعد میں علامہ نے ان میں کسی قدر ترمیم کر دی تھی لیکن راقم انھیں ابتدائی شکل ہی میں نقل کر رہا ہے:

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شرابِ ناب داد
روس را سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود
قہر او کوہِ گراں را زلزۂ سیماب داد

ملک و نا بُرد تجارت را به انگلستاں سپرد
جرمنی را چشم بے خواب و دلِ بیتاب داد
تا بر انگیزد نوائے حریت از سازِ دہر
صدرِ جمہوریہ امریکہ را مضراب داد
ہر کسے در خورد فطرت از جناب اُو بہ برد
بہرِ ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

خودی اور بین الاسلامیت

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء کی دہ سالہ مدت میں علامہ اقبال کے فکر کے دو شعبوں نے نہایت واضح اور معین راہِ عمل تجویز کر لی : ایک خودی اور دوسرے بین الاسلامی نظریہ ۔ آپ نے فرمایا کہ جس تصوف نے خودی کو مٹا دینے اور قطرے کو دریا میں گم ہو جانے کی تعلیم دی ہے ، وہ آبرومند انسانوں کا مسلک نہیں بلکہ کیش گوسفندی ہے جس نے قوموں کو ذوقِ حیات سے عاری کر دیا ہے اور خصوصاً مسلمان معاشرے پر اس غلط مکتبِ فکر کا وہ اثر پڑا ہے جس سے وہ زوال و انحطاط کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کر رہا ہے ۔ جب تک فکرِ اسلامی اور ادبیات اسلامی کو اس مہلک رجحان سے نجات نہ دلائی جائیگی اور ایک تنومند اور حیات افروز ادبی نصب العین قائم کر کے ادبیات اسلامیہ میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے گا ، مسلمانوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تغیر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک فکر و احساس کی وہ روح نہیں بدلے گی جس نے صدیوں سے اس قوم کو تنزل کا شکار بنا رکھا ہے ، زندگی کے حوالی میں کوئی بہتر صورت پیدا

نہ ہوگی۔

وطنیت (بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے) علامہ اقبال کے نزدیک بہت مکروہ ومبغوض نصب العین قرار پایا۔ وہ حب وطن اور وطن پروری کے تو نہایت پرجوش اور سرگرم حامی تھے لیکن وطنیت کے جس تصور نے دنیا کی قوموں کو مادی مفادات کی کشمکش اور رقابت میں اسیر کرکے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے، وہ تصور حیاتِ انسانی کے جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ یورپ کی قومیں علامہ اقبال کے نزدیک تباہی وبربادی کے راستے پر گامزن ہیں، اس لیے کہ ان میں وطنیت نے انتہائی عصبیت کی شکل اختیار کرلی ہے اور وہ سب بنی نوع انسان کو قتل کرنے، لوٹنے اور تباہ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں، اس کے ساتھ ہی علامہ نے اتحادِ عالم اسلامی کے نصب العین پر مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ چین سے مراکش تک سب مسلمان بھائی بھائی ہیں لہٰذا ان کو وطنیت پرستی کی لعنت سے محترز رہ کر پوری طرح متحد رہنا چاہیے۔

۱۹۰۹ء میں دو قومی نظریہ

علامہ اب اس امر کے بالکل قائل نہ رہے تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مل کر کوئی مشترک پروگرام بنا سکتے ہیں مثلاً ۱۹۰۹ء کا ایک واقعہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اس صدی کے عشرۂ اولیں میں امرتسر کے ہندو، مسلمان اور سکھ اربابِ ذوق نے ایک علمی وادبی مرکز قائم کر رکھا تھا جس کو "منروالاج" کہتے تھے۔ اس

مرکز کا ایک ماہ وار رسالہ بھی منروا کے نام سے جاری تھا۔ مارچ ۱۹۰۹ء کے اوائل میں منشی غلام قادر فرخ امرتسری نے علامہ اقبال کو لکھا کہ اپریل ۱۹۰۹ء میں منروا لاج کا سالانہ جلسہ ہے آپ اس میں شرکت فرمائیے۔ جواب میں علامہ نے لکھا کہ انہیں دنوں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے اس لئے لاج کے سالانہ جلسے میں شرکت کا حتمی وعدہ نہیں کر سکتا، اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ:

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ امرتسر کے مسلمانوں کے خیالات منروا لاج کی نسبت کچھ اچھے نہیں ہیں"

فرخ صاحب نے لکھا کہ بلاشبہ اس لاج میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے لیکن سب اخوت و مساوات پر کاربند ہیں۔ بہت کوشش کی جاتی ہے لیکن مسلمان اس میں شامل ہی نہیں ہوتے۔

علامہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو فرخ صاحب کے نام جو خط لکھا اس میں امرتسر کے مقامی حالات اور منروا لاج سے مسلمانوں کی بیزاری کا ذکر کر کے فرمایا کہ جن مجالس میں ہندوؤں کی کثرت ہو، ان کے متعلق عام طور پر مسلمانوں کا رویہ یہی ہے اور غالباً یہی رہے گا:

"باوجود کوشش بلیغ کے مسلمان برہمو سماج اور کانگریس کی مجالس سے متنفر رہے اور اب تک ہیں۔ خیر ان کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تحریکوں سے روکنے والے بہت سے تھے مگر میں دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے، ایک

ہندوؤں کا اور دوسرا عیسائیوں کا تو مسلمان فطرۃً عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوتے، خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی ان کے لئے کشادہ ہو۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیاز مذہب اس ملک سے اٹھ جانا چاہیئے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند ہوں مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ... ری ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ہے اور شعریت سے معمور ہے تاہم موجودہ حالات اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ سے ناقابلِ عمل ہے: (محمد اقبال)[۱]

اس دور کی اردو نظموں میں بلادِ اسلامیہ، ترانۂ ملی، وطنیت، ایک حاجی مدینے کے راستے میں، شکوہ، جوابِ شکوہ، خطاب بہ جوانانِ اسلام، غرۂ شوال، شمع و شاعر، حضورِ رسالت مآب میں، شفاخانۂ حجاز، دعا، فاطمہ بنتِ عبداللہ، شبلی و حالی، صدیق رض، کفر و اسلام، بلال اور متعدد دیگر نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ شاعر کے دل و دماغ میں اپنے مقدس نصب العین کو مقبول بنانے کا جذبہ بدرجۂ اتم پیدا ہو چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ نظمیں ہیں جن سے علامہ اقبال

۱۔ سفینۂ حیات، منشی غلام قادر فرخ۔ ۲۲۔ ۲۳

اسلامی ہند کی آنکھ کا تارا بن گئے اور تمام مسلمان بلا امتیاز مسلک وعقیدہ ان کے فدائی ہو گئے۔ اس زمانے میں مائیکرو فون نہ تھا لیکن اس کے باوجود پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار کے مجموں میں علامہ اقبال اپنی نظمیں اپنے آہنگ بلند و شریں میں سناتے تھے۔ جو سن سکتے تھے وہ بے خود ہو جاتے تھے اور جو سن نہیں سکتے تھے وہ بھی مسحور ہو کر بے حس و حرکت اپنے محبوب شاعر کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے۔

تعنون اور خواجہ حافظ

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار خودی کو سر علی امام کے نام سے معنون کیا۔ اس تعنون کو اکثر لوگوں نے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ معترضین نے کہا کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ہے اور ملت کو اعزاز نفس اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے، اس کو ایک خطاب یافتہ دنیا دار اور ایک ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی؟ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ادبی نصب العین کی تصریح کرتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کا نام لے کر ان کو جلی کٹی سنائیں۔ مثلاً:

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او
مے علاج ہول رستا خیز او
رفت و شغل ساغر و ساقی گزشت
بزم رندان و مے ساقی گزشت

گوسفند است و نوا آموخت است
عشوہ و ناز و ادا آموخت است

اس پر بھی صرف صوفیہ ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے ارباب ذوق بھی مشتعل ہوئے۔ بہرحال "اسرارِ خودی" کے دوسرے ایڈیشن سے یہ تمعنون اور خواجہ حافظ والے اشعار حذف کر دیئے گئے۔ جب بعض نیاز مندوں نے جنہیں ان دو باتوں کے خلاف شکایت پیدا ہوئی تھی، علامہ سے استفسار کیا کہ اب ان کے حذف کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان سے جو مقصد پیش نظر تھا، وہ پورا ہو چکا ہے اس لئے ان کو باقی رکھنا غیر ضروری سمجھا گیا۔

سر علی امام کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، ممکن ہے کسی موقع پر ان کے جذبہ اسلامیت نے علامہ اقبال کو متاثر کیا ہو اور علامہ نے اسی تاثر کے ماتحت اسرارِ خودی ان کے نام معنون کر دی ہو لیکن خواجہ حافظ کے متعلق علامہ کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح تھا وہ ان ادبیات اسلامیہ کو ملت کیلئے مہلک سمجھتے تھے، جو درس حیات اور تلقین عمل کے بجائے جمود و ہلاکت اور حقائق زندگی سے فرار کی طرف لے جائیں۔ حافظ کے کلام کو انھوں نے بہ طور مثال پیش کیا تھا کیونکہ وہ جمالیاتی اعتبار سے بیحد پرکشش ہے اور نوجوانوں کو ایک لمحے کے اندر مسحور کرکے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے لیکن اس کی تعلیم ان نوجوانوں کو حیات و عمل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے گویا اس قسم کا ادب ایک بیحد لذیذ زہر ہے جس سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہیئے۔

شعر فارسی اور اسلام

مولوی سراج الدین احمد پال کے نام ایک خط میں علامہ نے لکھا کہ فارسی کے شعرا کے

مطالعہ میں ایک بات ہمیشہ زیرِ نظر رکھیے:

حقیقت یہ ہے کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل اور شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریقۂ تنسیخ کا ہے اور یہ طریقہ وہی قومیں ایجاد یا اختیار کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ .... ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرف سے مذموم بیان کیا ہے۔

اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں مثلاً

نمازی زیبِ شہادت اندر رنگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر از وست

در روزِ قیامت ایں بہ او کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامی کی تردید میں اس سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت طریق کار اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نکتۂ[1] خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے...... جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب و غریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس وجہ سے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔

اور ہم نے بھی اس طویل خط کو اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ مسلمان ادبا و شعراء کو ادبیاتِ اسلامیہ کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ بالوضاحت معلوم ہو جائے۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد پال کے نام جو خواجہ حافظ پر ایک بسوط خط لکھنا چاہتے تھے، علامہ اقبال نے چند مفید مشورے دیے ہیں اور آخر

۱۔ علامہ اس لفظ کو کہیں "نکتہ" اور کہیں "نقطہ" لکھتے ہیں لیکن صحیح لفظ نقطہ ہی ہے۔

میں یہ سطور لکھی ہیں:۔

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں۔ اس پر انشا اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو انکو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا!

۱۔ اقبال نامہ عطاءاللہ حصہ اول ۳۶-۳۷ اور ۴۴-۴۵

دوسری فصل

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک

پیشتر اس کے کہ ہم پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے اور علامہ اقبال کی نئی مصروفیتوں کا ذکر کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر مسلمانوں کے اس پورے سیاسی پس منظر کو واضح کر دیا جائے جس نے اقبال کے جذبات و تخیلات پر گہرا اثر ڈالا۔

تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ

مشرقی بنگال کے مسلمان مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جب تک صوبہ بنگال پر سیاست، تجارت، تعلیم کے اعتبار سے اکثریت کو ہمہ گیر اقتدار حاصل رہے گا مسلمان ہرگز نہ پنپ سکیں گے۔ وہ آئے دن مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی ایسا انتظامی قدم اٹھایا جائے جس سے بنگال کے کروڑوں مسلمانوں کو بھی اپنی تعمیر کا موقع مل سکے۔ نواب سلیم اللہ خاں (ڈھاکہ) بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر انگریز کو تقسیم بنگال پر رضا مند کر لیا۔ چنانچہ اعلان ہو گیا کہ مشرقی بنگال اور آسام کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا۔ اس اعلان پر مسلمان خوش ہوئے کیونکہ نئے صوبے میں انھیں اپنی اکثریت کا

یقین تھا اور وہ مطمئن تھے کہ اب وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے موثر تدابیر اختیار کر سکیں گے لیکن ہندو بنگالیوں نے جو سیاسی لحاظ سے زیادہ منظم اور مضبوط تھے، تقسیم بنگال کے خلاف ایک ہندوستان گیر شورش برپا کر دی اور اسے سودیشی کی ترویج اور ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بنا کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اس سے متاثر ہو کر بعض بنگالی نوجوانوں نے بم پھینکا اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ آخر دسمبر ۱۹۱۱ء کو انگریز نے عاجز آکر تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کی ناراضگی کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس کے بعد جب سر سلیم اللہ خاں کو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا تو اس غیور بزرگ نے اسے قبول نو کر لیا اس لیے کہ عطائے شاہانہ کو رد کرنا اس زمانے کے رواج اور امراء کی وضعداری کے خلاف تھا لیکن اس خطاب کے متعلق علی الاعلان یہ کہا: "یہ طمعہ ایک طعمہ ہے، ایک رشوت ہے اور میرے گلے میں ذلت اور لعنت کا طوق ہے"۔ انگریز نے کچھ بنگالیوں کی سرکشی اور بم بازی سے متاثر ہو کر اور کچھ مسلمانوں کی تالیف قلوب کیلئے اعلان کیا کہ ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتے سے دہلی میں منتقل کر دیا گیا ہے کیونکہ دہلی شاہان سلف کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے اس عزت کا مستحق ہے۔ اقبال نے بھی تقسیم بنگال کی تنسیخ پر تو دوسرے مسلمانوں ہی کی طرح صدمہ محسوس کیا لیکن انگریز کی طرف سے اس کی تلافی کا کسی حد تک اعتراف کیا۔ چنانچہ انھوں نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا کہ حکومت نے انتقال دارالسلطنت سے گویا بنگالیوں کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی ہے اور بنگالی سمجھتا ہے کہ اس کی جیت ہوئی ہے۔ اس خط میں دو شعر بھی لکھتے ہیں:

مندمل زخم دل بنگال آخر ہو گیا　　　وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آگیا　　　مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی[۱]

یہی ۱۹۱۱ء تھا جس میں روس و برطانیہ نے ترکی و ایران کو ہضم کرنے کے لیے اتحاد کیا۔ ادھر شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں کو تختۂ مشق ستم بنایا۔ ادھر طرابلس میں ترکوں کو آگ اور خون سے سابقہ پڑا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان کی آفت نازل ہوئی جو ۱۹۱۳ء تک رہی۔ مولوی ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی اپنے اپنے حلقوں میں تحریر و تقریر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اظہارِ حسیاتِ ملیہ، اتحاد اور اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے آمادہ و تیار کر رہے تھے۔ اقبال نے "طرابلس کے شہیدوں کا لہو" اس میں "مسلم"، "فاطمہ بنتِ عبداللہ" اسی زمانے میں لکھیں۔ "شمع و شاعر"، "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" تینوں نظمیں ایران طرابلس بلقان وغیرہ کے حوادث سے متاثر ہو کر لکھی گئیں اور ان کا ایک ایک مصرع مسلمانانِ ہند کے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو اس زمانے میں جوش و خروش کے کمال کو پہنچ گئے تھے۔ "جوابِ شکوہ" تو مجروحینِ بلقان کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ہی لکھی گئی تھی۔

جنگِ یورپ اوّل

۱۹۱۳ء کے وسط میں جنگِ بلقان ختم ہوئی اور ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کا آغاز ہوا۔ اقبال طبعاً بھی اور مصلحتاً بھی عملی سیاسیات سے علیحدہ رہے، بلکہ غیر سیاسی مجالس میں بھی نظر نہ آتے تھے۔ مولانا شوکت علی نے ان کو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ کا لج

۱۔ مکاتیب اقبال حصہ دوم ۱۵۲-۱۵۳

کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو علامہ نے جواب لکھا:

بھائی شوکت۔ اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بدتمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کبھی عمروں تک ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیئے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر ہے کہ ملاقاتِ ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونیکا امکان بہت کم ہے![1]

ترکوں سے جنگ چھڑتے ہی حکومت نے مولانا محمود الحسن شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیزگل کو حجاز سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا بھیج دیا۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نظر بند کر دیئے گئے اور ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی بھی پابندِ و مقید قرار پائے۔

میثاق لکھنو ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاق لکھنو طے پایا یعنی جب ان دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس لکھنو میں ہوئے تو ان کے اکابر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلاف کو دور کرنے کے لئے باہم قرارداد کی کہ آئندہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق

۱۔ مکاتیب اقبال حصہ اوّل ۲۵۵

ہوگا۔ جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے، ان میں ان کو اکثریت سے محروم کر کے صرف مساوات دی جائے گی اور ان کی زائد نشستیں اقلیتوں میں تقسیم کر دی جائیں گی اور جن صوبوں میں مسلم اقلیت ہے ان میں مسلمانوں کو پاسنگ دیا جائیگا۔ لکھنؤ میں کانگرس کے صدر امبیکا چرن موزمدار اور لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے۔ میثاق ان دونوں اجلاسوں میں پیش ہوا اور دونوں جماعتوں نے اس کی تصدیق و توثیق کر دی۔

علامہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے کیونکہ اس کے ماتحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو موثر اقتدار نہ ملتا تھا اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ علامہ کا خیال تھا کہ ایسا میثاق اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ہو اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر نا ممکن ہے، نہ اس کیلئے کوشش کرنا مفید ہے۔

اگرچہ علامہ اقبال سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے محترز رہتے تھے، لیکن ان کی شخصیت سیاسیات (کیا ملکی اور کیا غیر ملکی) پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ قوم کے شاعر، یعنی قوم کی آنکھ[1] تھے اور قوم کی ہر مصیبت پر اشک بار نظر آتے تھے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ[1]

---

[1] شاعر، بانگ درا ۵۳

جنگ کے زمانے میں علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" مکمل کیں۔ ۱۹۱۳ء میں "اسرارِ خودی" لکھنی شروع کی، ۱۹۱۸ء میں "رموزِ بیخودی" ختم کی۔

رولٹ بل ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی۔ جون ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی مزید دستوری اصلاحات کے متعلق مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ شائع ہوئی۔ ۱۹۱۹ء کے آغاز میں حکومت نے رولٹ بل پاس کر دیا جس میں عدالت اور پولیس کو بہت زیادہ اور ناواجب اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس قانون کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جنگ کے خاتمے پر ہزارہا ہندوستانی اپنے ملک میں واپس آ رہے تھے۔ فوجی بھی غیر فوجی بھی، تاجر بھی صنعت کار اور مزدور بھی، سیاسی رہنما اور کارکن بھی۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مبادا ہندوستان میں فتنے کا باعث ہوں۔ لہٰذا پولیس کو ایسے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں کہ جس کو بھی چاہے وارنٹ بغیر گرفتار کر لے اور جس مکان کی تلاشی لینی چاہے اس میں بے تکلف گھس جائے۔ اس پر گاندھی جی نے ہڑتالیں کرائیں اور ستیاگرہ کیا۔ پنجاب میں حکام نے سخت مظالم روا رکھے۔

مارشل لا جنرل ڈائر نے جلیانوالا باغ امرتسر میں اندھا دھند گولیاں چلوا کر صدہا انسانوں کو نذرِ اجل کر دیا۔ پنجاب میں مارشل لا نافذ کیا گیا جس میں عوام اور طالب علموں سے نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا۔ اب پورا ملک بلا امتیاز مذہب و ملت احتجاج اور تنفر کا ہنگامہ زار بن رہا تھا۔ مسلمانوں کے دلوں پر جلیانوالا باغ اور پنجاب کے

مظالم سے بھی زیادہ گہرا جرکہ ترکی کی شکست سے لگ چکا تھا جس کی وجہ سے خطرہ تھا کہ ترکان آلِ عثمان کی آزادی و خودمختاری خاک میں ملادی جائے۔ خلافتِ اسلامیہ کی مسند کے گرد فرنگی گدھ منڈلا رہے تھے۔

مطالبات

ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحدہ آواز سے دو مطالبے کئے ایک جلیاں والا باغ کے حادثۂ فاجعہ اور مارشل لاء کے سلسلے میں جن افسروں کو جور و جفا اور قتل و خون کا ملزم پایا جائے، انھیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ دوسرے حکومت برطانیہ خلافتِ اسلامیہ کی حفظ و بقا کے لیے ترکوں سے انصاف کرے کیونکہ یہ مطالبہ برطانیہ کی سات کروڑ مسلم رعایا کے نازک ترین مذہبی جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔

انھیں دنوں کا ذکر ہے ایک دن راقم خدمت میں حاضر تھا۔ علامہ خاموش بیٹھے تھے لیکن غصے کے آثار چہرے سے ظاہر تھے۔ ایک دم فرمایا۔ دیکھئے سالک صاحب مولوی ابوالکلام نے جو "تذکرہ" لکھا ہے اس کے دیباچے میں کوئی صاحب مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ اقبال پہلے کافر تھا۔ "الہلال" نے اس کو مسلمان بنایا۔ میں یہ سنکر چونکا۔ "تذکرہ" تو پڑھا تھا لیکن اس کے دیباچے پر محض سرسری نظر ڈالی تھی۔ حضرت علامہ نے خود ہی "تذکرہ" میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیباچہ نکال کر پڑھا تو لکھا تھا کہ اقبال کی مثنویاں تحریکِ "الہلال" ہی کی آواز بازگشت ہیں اور آگے چل کر یہ بتایا تھا کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے تھے گئے۔ ان میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" راقم نے عرض کیا کہ مولوی فضل الدین احمد نے حقیقتاً غلط لکھا۔ ان کو آپ کے مسلک و مذہب کے متعلق کچھ

بھی معلوم نہیں۔ انہیں لکھنے پڑھنے سے کیا سروکار۔ وہ تو مطبع الہلال کے مہتمم تھے۔ اس کے بعد راقم نے چند ایسے فقرے کہے جن سے مقصود یہ تھا کہ علامہ کے دل میں مولانا ابوالکلام کے متعلق کوئی کدورت نہ رہے۔ خدا جانے یہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔ بہر حال چونکہ راقم نظم و نثر اور جذبات اسلامی میں ان دونوں ہستیوں سے یکساں مستفید ہوا تھا، اس لئے اپنی طرف سے کمی نہ کی:

دل کو میں روؤں یا جگر کو میر   میری دونوں سے آشنائی ہے

اس کے بعد علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھ کر ان سے بھی اس بات کی شکایت کی!

اس زمانے میں حضرت علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی سے مستفیدانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا جو کئی سال تک جاری رہا۔ اور اس میں لغت، ادب، فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کے بیسیوں مسائل زیر بحث آئے۔ یہ تمام خطوط (یعنی جو علامہ نے لکھے) اقبال نامے میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ علامہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کبھی انھیں فقہ یا تفسیر وغیرہ میں کوئی الجھن ہوتی، وہ اپنے دوست مولویوں کو خطوط لکھتے۔ ان کو تلاش کرا کر بلواتے اور ان سے باتیں کرتے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگرس، مسلم لیگ، اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے۔ اس موقع پر گاندھی جی، تلک جی، مسز بیسنٹ، پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے رہنما کانگرس میں شریک

۱۔ اقبال نامہ عطاء اللہ صفحہ ۱۱۰-۱۱۱

ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیا لال میں ہوا حکیم اجمل خاں نے صدارت فرمائی۔ اس موقع پر مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بھی چھندواڑہ جیل سے رہا ہو کر آ پہنچے۔ علامہ اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر کار میں لاہور سے چلے کہ امرتسر کے ہنگاموں کو دیکھ آئیں۔

اقبال اور علی برادران

وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران سے بغل گیر ہوئے، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشکبار تھے علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے، جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے :

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند ——— قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اِک لہو کی بوند ہے ——— مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر ——— کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

ترک موالات

امرتسر کے ان اجلاسوں کا اثر یہ ہوا کہ ہندو اور مسلم عوام گاندھی جی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ کانگرس کے ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مطالبۂ تحفظ خلافت کی علی الاعلان حمایت شروع کر دی اور کانگرس اور لیگ نے مل کر فیصلہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کی قسط اصلاحات

کو مسترد کر دیا جائے اور کوئی ہندوستانی ان اصلاحات کے ماتحت کسی کونسل کی ممبری کا امیدوار نہ ہو جب حکومت نے جلیانوالا باغ اور مارشل لا کی حوادث ہائلہ کی تحقیقات کرا کر متعلقہ افسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں بددلی پھیل گئی اور ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔ پانسو علمائے ترکِ موالات بہ کفار کا فتویٰ دیدیا۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ، سرکاری خطابات، سرکاری مدارس، سرکاری کونسلوں اور سرکاری عدالتوں کا ترک۔ یہ اس تحریک کے اجزا تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول بنانے کے لئے ملک بھر کا دورہ کیا۔ گاندھی جی پورے ملک کے واحد لیڈر تسلیم کئے گئے۔ اس تحریک میں ہزارہا انسان گرفتار ہو کر قید و بند کے سپرد ہوئے۔ چونکہ عدم تعاون سب کا مسلک تھا اس لئے کوئی گرفتار بلا عدالت میں صفائی پیش نہ کرتا اور مقدمے کی تفصیلات کے آخر میں سزائے قید سن کر ہنسی خوشی جیل کو روانہ ہو جاتا۔

وفدِ خلافت یورپ میں

تحریک کے زور میں آنے سے پہلے مولانا محمد علی ایک وفدِ خلافت لے کر یورپ گئے تاکہ حکومت برطانیہ، برطانوی عوام اور جمہور ممالک، فرنگ کو اس مسئلے میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ بتائیں۔ منظور یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ اور خاص کر برطانیہ کے اربابِ حکومت مسلمانوں کی مذہبی تالیفِ قلوب ہی کے نقطۂ نظر سے خلافتِ اسلامی یعنی سلطنت ترکانِ عثمانی سے انصاف کریں۔ اس پر علامہ اقبال نے لکھا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے   تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

یہ وفد ناکام و نامراد لوٹا اور ہندوستان میں انگریز کے خلاف تحریک اور بھی شدت اختیار کر گئی لیکن فرنگی اس سے مس بھی نہ ہوئے۔ انھیں بار بار وہ وعدے یاد دلائے گئے جو انھوں نے جنگ کے دوران میں ترکی سلطنت کی بقا کے لیے کیے تھے لیکن کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا جب استنبول پر انگریزوں کا فوجی قبضہ ہو گیا خلیفۃ المسلمین فرنگی کی قید میں اسیر ہو گئے اور ترکان احرار شدید ترین تشدد کا نشانہ بننے لگے تو ان غیور و شجاع نوجوانوں نے استنبول سے دور اناتولیا میں مصطفیٰ کمال پاشا کے زیر قیادت اپنے شکستہ و سوختہ، مجروح اور ماتم زدہ ملک کی قوتوں کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ ترکوں کو محکومی اور ذلت سے نجات دلا کر پھر آزاد اور آبرومند قوموں کی صف میں کھڑا کر دیں لیکن استنبول میں اتحادیوں کے اشارے سے خلیفۃ المسلمین نے مصطفیٰ کمال پاشا کی موت کے حکم پر دستخط کر دیئے جو سلطنت اور خلافت کا باغی تھا۔

معاہدۂ سیورے ادھر مصطفیٰ کمال پاشا نے اناتولیا میں ترکوں کی ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھ کر یونانیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا جن کو اتحادیوں نے اکسا کر ترکوں پر حملہ آور کرا دیا تھا اور ادھر سیورے کے مقام پر اتحادیوں نے اپنے قیدی خلیفہ سے ایسی شرائط صلح پر دستخط کرا لیے

جو حقیقت میں ترکوں کے لیے پیغام اجل تھیں مثلاً تھریس اور سمرنا یونانیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ استنبول آرمینیہ کے علاقہ میں شامل کر کے اتحادیوں کے سپرد کر دیا گیا اور ترکی کو صرف پندرہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی گئی۔ معاہدہ سیورے سے ساری دنیائے اسلام تڑپ اٹھی۔ ہر طرف سے شور احتجاج بلند ہوا۔ مصطفیٰ کمال کے بہادر اور جاں باز ساتھیوں کو دنیا بھر کی حمایت نصیب ہو گئی۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کو بڑا فروغ ہوا۔ ہزاروں مسلمان سول نافرمانی کر کے جیلوں میں چلے گئے۔

اقبال کی بے تعلقی

علامہ اقبال ان تمام ہنگاموں سے الگ تھلگ "پیام مشرق" کی ترتیب میں مصروف تھے۔ انھوں نے اس زمانے کی پرشور سیاسیات سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ اس امر سے بیحد مسرور و مطمئن تھے کہ فرنگی کے مقابلے میں ہندی مسلمان کی خودی بیدار ہو رہی ہے اور وہ طلب حریت میں قدم آگے بڑھا رہا ہے لیکن انھیں ایک تو "قومیت متحدہ ہند" کے نصب العین اور وطنیت کے سیاسی تصور سے کوئی امید خیر نہ تھی دوسرے وہ اس بات کے قائل بھی نہ تھے کہ ہندوستان میں کوئی ایسی قوم موجود ہے یا بن سکتی ہے جس کو ہندوستانی قوم کہا جا سکے۔ چنانچہ صرف ایک ہی سال بعد اس تحریک کے خاتمے پر شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے ہنگاموں نے علامہ کے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ محض انگریز دشمنی کی بنا پر کسی قومیت کی تعمیر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے دوسرے عناصر و شرو ط ضروری ہیں۔

۱۹۲۰ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شریک تو ہوئے لیکن کوئی مستقل نظم نہ سنائی بلکہ دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھ کر سٹیج سے اتر آئے۔ پیسہ اخبار[۱] اور امتیاز علی تاج کے رسالہ "کہکشاں" میں یہ نظمیں درج ہوئیں۔

خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام

ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں مسلمانوں کو جن کوائف و حوادث سے سابقہ پڑ رہا تھا اور علامہ اقبال کو قدرت سے جو درد مند اور حساس دل عطا ہوا تھا، ان دونوں کا تقاضہ یہی تھا کہ اقبال کا دل پھوڑا بن کر پکے اور پھر پھوٹ بہے لیکن وہ جانتے تھے کہ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے شدید اور شورانگیز انداز اختیار کرنا کسی حال میں مفید اور نتیجہ خیز نہیں اور اس شورانگیز اظہار کا کھوکھلاپن وہ تحریک ترک موالات کے دوران میں دیکھ ہی چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کا انتظار کیا اور جب اپریل ۲۲ء میں جلسہ ہوا تو علامہ نے ہزاروں درد رسیدہ اور غم زدہ مسلمانوں کے مجمع میں "خضرِ راہ" پڑھی۔ راقم الحروف اس جلسے میں موجود تھا۔ ایک تو اس نظم میں اقبال کے شاعرانہ تخیل اور بدیع اسلوب بیان کا جمال پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا اور ایک ایک شعر پر اربابِ ذوقِ سلیم وجد کر رہے تھے۔ دوسرے اس میں علامہ نے جنگِ عظیم کے سلسلے میں فاتح اقوام کی دھاندلی، انکی ابلیسانہ سیاست، سرمایہ دار کی عیاری، مزدور کی بیداری، عالم اسلام خصوصاً ترکان آلِ

۱۔ پیسہ اخبار ۱۵ اپریل ۲۰ء "ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز" الخ

عثمان کی بے دست و پائی پر موثر اور بلیغ تبصرہ کیا ہے اور اسی سلسلے میں نسلی قومیت اور امتیاز رنگ و خون کے تصورات پر بھرپور چوٹ کی ہے۔ اس نظم کے حسن اور اس کے درد و اثر میں کلام نہیں لیکن اس کی ترکیب زیادہ تر واقعات وا حقائق کو بیان کرنے پر مبنی ہے اور آخری چند اشعار کے سوا کام رانی و شادمانی اور امید اور امنگ کے آثار کم ہیں۔ اس لئے کہ حالات ہی ایسے تھے۔ ترکی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جوش و خروش کے عالم میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا انجام انہیں معلوم نہ تھا!

لیکن جب ۱۹۲۴ء میں علامہؒ نے انجمن ہی کے اجلاس میں "طلوع اسلام" پڑھی تو حالات بدل چکے تھے۔ ترکان احرار اپنی آزادی کے جہاد میں کامیاب ہو چکے تھے یعنی ان کی فتح و ظفر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا ترکی کے لئے آبرومندانہ زندگی کا سر و سامان ہو رہا تھا اس لئے اس نظم کا لہجہ پہلے ہی شعر سے امید افزا، ولولہ انگیز اور روشن و درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور یہ درخشانی آخر تک نور بکھیرتی چلی گئی ہے۔ سرمایہ داری کی مخالفت، مزدور کی حمایت ایثار اور اسلام کے امید افزا حالات اس نظم کے نمایاں خد و خال ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "خضر راہ"[1] اور "طلوع اسلام"[2] نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا دیا اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔

۱۔ خضر راہ بانگ درا ۲۸۸۔

۲۔ طلوع اسلام، بانگ درا ۳۰۳

احیائے لیگ کی کوشش

ترک موالات اور سول نافرمانی کے جوش و خروش نے عامتہ المسلمین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا مجاہد اور سرفروش قسم کے رہنما سیاست کے میدان پر قابض تھے۔ آئین پسند، تعاون پرست اکابر ان حالات پر مضطرب ہو رہے تھے اور اوپر کے طبقوں میں کوشش کی جا رہی تھی کہ مسلم لیگ کو جو اب کانگرس کا دم چھلا بن کر اپنی ہستی کو کم کر چکی تھی، از سر نو زندہ کر کے آئینی طور طریقے اختیار کیے جائیں۔ چنانچہ سر آغا خاں اور مشیر حسین قدوائی ایک طرف خلافت کی حمایت میں بیان دے رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر محمد علی جناح کی وساطت سے مسلم لیگ کے احیا کا اہتمام کر رہے تھے۔ اقبال کو اس فرسودہ اور محکومانہ سیاست سے اختلاف تھا۔ انھوں نے "صدائے لیگ" کے عنوان سے چند اشعار لکھے:

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اترے مسیح بن کے محمد علی جناح

نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی بتا ہمیں
اے جان برلب آمدہ! تیری ہی کیا صلاح

دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح

آغا امام اور محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترک سواد حرم مباح

بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجاب غیبت کبریٰ دریدہ است

اقبال اور گاندھی جی

یعنی اگرچہ علامہ اقبال کو قومیت متحدہ کے تصور سے اختلاف تھا، لیکن چونکہ وہ استعمار کے سخت

۱۔ زمیندار ۹ نومبر ۱۹۲۱ء

مخالف تھے، اس لئے اختلاف کے باوجود مجاہدین حریت کی بہادری اور اولوالعزی اور ایثار پیشگی ان کے نزدیک محبوب تھی اور وہ ان کے مخالفین کی حمایت کسی حال میں نہ کر سکتے تھے۔ انہیں دنوں علامہ نے گاندھی جی کے عزم بلند اور ان کی بے سروسامانی پر نہایت خلوص و قدردانی کے جذبے سے چند اشعار آب دار ارشاد فرمائے:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کم زور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض توتیا
پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمال وقار سے
وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا
"خارا حریف سعی ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست دربن دنداں خلال را"[۱]

اسی زمانے میں علامہ نے اکثر ظریفانہ اشعار لکھے جو وقتاً فوقتاً "زمیندار" میں شائع

۱۔ زمیندار ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء

ہوتے رہے اور بانگ درا کے آخر میں درج ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار و قطعات ترتیبِ بانگ درا کے وقت نظر انداز کر دیئے گئے۔ لیکن بعض لوگوں نے وہ بھی نومبر ۱۹۲۱ء، فروری ۱۹۲۲ء۔ اپریل ۱۹۲۲ء، مئی ۱۹۲۲ء کے 'زمیندار' کے فائلوں میں سے نقل کر کے چھاپ دیئے ہیں۔

رات بھر میں تعمیر مسجد

مئی ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ اس کے پاس ہی ایک مسجد بھی بننی چاہیئے۔ یہ مطالبہ آگ کی طرح پھیل گیا جوش و خروش کا زمانہ تھا مسلمانوں نے خود ہی ایک قطعہ زمین (ملکیت بلدیہ لاہور) تجویز کیا صدہا نوجوان نمازِ عشاء کے بعد عمارتی مسالے کی فراہمی، بنیادوں کی کھدائی اور تعمیر میں مصروف ہوگئے اور نمازِ فجر تک دو دکانیں اور ان کے اوپر مسجد کی منزل پوری کر دی (پھر کئی سال بعد انجمن اسلامیہ پنجاب نے اس مسجد کو مناسب و موزوں آرائش اور تزئین تعمیر سے مکمل کیا) علامہ نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر چند اشعار لکھے پہلا شعر یہ تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا[1]

میکلوڈ روڈ سے مراجعت

۱۹۲۲ء میں حضرت علامہ انارکلی بازار کے بالا خانے سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی ایک پرانی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ یہ کوٹھی پربھات سینما اور رتن سینما کے درمیان واقع

۱۔ ان اشعار کے لئے دیکھو، بانگِ درا، ۳۳۶۔

ہے۔ راقم الحروف جب تحریک خلافت میں ایک سال کی قید کاٹ کر واپس آیا اور حسب عادت علامہ سے ملنے کے لئے انارکلی کو چلا تو احباب نے بتایا کہ وہ میکلوڈ روڈ کے فلاں مکان میں چلے گئے ہیں جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میکلوڈ روڈ سے اندر جاکر ایک فرسودہ مکان ہے اور دائیں ہاتھ اس مکان کا چھوٹا سا "ضمیمہ" ہے۔ یہاں علی بخش بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر اچھل پڑا اور جھٹ علامہ کو اطلاع دی۔ میں اس "ضمیمہ" کے ایک کمرہ میں جس کو علامہ نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا، داخل ہوا ہی تھا کہ علامہ اپنے معمول کے خلاف اٹھ کر لپکے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کرنے لگے مجھ سے جیل کی زندگی کی تفصیلات دریافت کیں اور یہ سن کر کہ وہاں صبح سے شام تک ایک ضبط و نظم کی شدید پابندی کرنی پڑتی ہے، فرمایا: "الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر" کا غالباً یہی مطلب ہے؛ جس طرح قیدی ہر کام مقررہ وقت پر انجام دیتا ہے محنت مشقت میں مصروف رہتا ہے اور روکھی سوکھی کھاکر اور موٹا جھوٹا پہن کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور ہمیشہ نیک نامی کے ساتھ جیل سے نجات پانے کی دعائیں کرتا ہے۔ اسی طرح مومن دنیا میں پابندی، محنت، سادگی فرض شناسی کی زندگی بسر کرتا ہے تعیش سے مجتنب رہتا ہے اور آبرو کے ساتھ اس تیرہ خاکدان سے رخصت ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں حاضر ہونیکا خواہاں رہتا ہے۔ کافر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے اسی قسم کی بصیرت افروز باتیں ہوتی رہیں، پھر میں نے عرض کیا "حضرت! کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہ ملتی تھی؟ یہ تو بہت ہی پرانی ہے۔" ہنس کر فرمانے لگے۔ "جی ہاں یہ تو صرف میری دعاؤں ہی کے سہارے

کھڑی ہے، ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات باقی نہیں"۔

اس زمانے میں سید محمد علی جعفری علامہ سے اکثر ملتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب سے علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہنے لگے، ان کی حالت میں ایسا تغیر پیدا ہوا گویا وہ بالکل ایک نئے شخص بن گئے۔ میں بارہا جاتا اور کہتا کہ سیر کیا کیجیے تاکہ صحت اچھی رہے لیکن وہ ہلنے جلنے سے متنفر تھے اور ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے تھے، حقہ بہت پیتے تھے۔ جب علامہ نے وہ نظم پڑھی ع

کبھی اے حقیقتِ منتظر ... تو اس میں ایک شعر کا مصرعِ ثانی تھا ع

جو وطن ہو دشمن آبرو تو اماں ہے ملکِ حجاز میں

بعض لوگوں کے نزدیک یہ اخبار "وطن" (مدیر۔ مولوی انشاء اللہ) پر چوٹ تھی جس میں علامہ کے خلاف ایک مضمون چھپا پا گیا تھا۔

علامہ ہروی سے ملاقات اس زمانے میں علامہ بہت سے علمی و دینی مسائل پر غور و خوض اور مطالعے میں مصروف تھے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون، فقہ اور اجتہاد کے بہت سے مسئلوں کے علاوہ زبان و مکان کے متعلق بھی تحقیق و تدقیق کر رہے تھے؛ چنانچہ سید سلیمان ندوی، مولانا احمد دین امرتسری، مولانا غلام مرشد اور دیگر علماء سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ قدیم و جدید مسلمان علماء و فلاسفر نے زبان و مکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا سراغ لگائیں۔ سید محمد علی جعفری نے ایران کے ایک فاضل علامہ عبدالعلی ہروی الطہرانی سے جو اس وقت لاہور میں مقیم تھے، علامہ کی ملاقات کرائی؛ علامہ ہروی بے حد ذہین اور طباع اور لسان آدمی واقع ہوئے تھے۔

عقائد میں کچھ بابیت اور کمیونزم کی طرف مائل تھے یعنی جامد مولویوں میں سے نہ تھے لیکن ان سے متعدد ملاقاتوں کے بعد بھی علامہ کا اطمینان نہ ہوا۔ پھر جعفری صاحب نے مولوی حشمت علی خیر اللہ پوری سے بھی علامہ کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ یہ صاحب حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے خالہ زاد بھائی اور ڈاکٹر محمد طفیل سول سرجن کے والد ماجد تھے فلسفے میں درخور وافی رکھتے تھے۔ اور زمان و مکان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

نوابانِ کرنال کا مقدمہ

مرزا جلال الدین فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں نوابان کرنال سجاد علی خاں، لیاقت علی خاں اور عمر دراز علی خاں کی جائداد کے متعلق جھگڑا شروع ہو گیا تھا جب کمشنر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مقدمہ رکوا دیا اور تصفیے کے لئے نواب سر ذوالفقار علی خاں، نواب محمد حیات خاں نون اور ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کو ثالث مقرر کر دیا۔ فریقین نے اپنے اپنے وکیل بھی تجویز کر لئے۔ عمر دراز علی خاں کے وکیل اور قانونی مشیر علامہ اقبال تھے۔ اور سجاد علی خاں کا وکیل میں تھا۔ نواب ذوالفقار علی نے کہا "بھئی اکٹھے چلیں گے"۔ چناں چہ ہم سب مل کر وہاں گئے۔ ہم اکٹر لونی ہاؤس میں ٹھہرائے گئے۔

ہم نے کہا ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم پہلے سجاد علی خاں کے ہاں اور پھر عمر دراز علی خاں کے ہاں ٹھہریں گے؛ چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے اپنے بستر الگ کمروں میں لگوائے۔ میں اور علامہ پاس پاس دو کمروں میں مقیم ہوئے۔ جب صبح کو ناشتے کے لئے کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو علامہ نے کہا "بھئی میز کی ترتیب دیکھ کر

اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی لیڈی کا ہاتھ ہے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی اس میز کو کسی لیڈی ہی نے آراستہ کیا تھا جس کو لیاقت علی خاں انگلستان سے ہاؤس کیپر بنا کر ساتھ لائے تھے۔

"ہم نے فریقوں کے کاغذات دیکھے اور بات چیت کے لیے تیار ہو گئے چھٹے ساتویں دن فریقین میں مصالحت ہو گئی۔ علامہ اقبال کی روزانہ فیس دو سو روپے تھی اور میری ڈیڑھ سو روپے۔"

یہ ۱۹۲۲ء کے واقعات ہیں، اسی سال لیاقت علی خاں انگلستان سے بیرسٹر بن کر آئے تھے۔ جب ان کے برادرِ بزرگ نواب سجاد علی خاں نے انھیں پنجاب ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ کے طور پر درج کرانا چاہا تو درخواست پر میاں سر محمد شفیع اور مرزا جلال الدین ہی کے سرٹیفکیٹ پیش ہوئے تھے۔

سر کا خطاب

۱۹۲۳ء کے پہلے ہی دن علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا گیا۔ چونکہ تحریک ترکِ موالات کی وجہ سے عوام میں سرکاری خطابات کے خلاف ایک گونہ نفرت پیدا ہو چکی تھی اس لیے مسلمان علامہ اقبال جیسی محبوبِ عام شخصیت کا خطاب یافتہ ہونا تصور بھی نہ کر سکتے تھے، طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہونے لگیں، یہاں تک کہ میر غلام بھیک نیرنگ نے جو علامہ کے قدیم اور مخلص ترین احباب میں سے تھے، علامہ کو ایک خط لکھا جس میں اندیشہ ظاہر کیا کہ اب آپ شاید آزادیٔ اظہار سے کام نہ لے سکیں۔ اس پر علامہ نے ان کو خط لکھا جس میں تحریر فرمایا: "قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے

خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ! اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں اس کا دل مومن ہے![۱] راقم الحروف نے بھی جو اس کے دو ماہ قبل ترکِ موالات میں سال بھر کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا، "زمیندار" میں چند اشعار شائع کیے اور ایک دو کالم "افکار حوادث" کے بھی لکھ دیئے، وہ اشعار زبان زدِ عام ہو گئے لیکن وہ ایک فوری جذبہ تھا۔ اشعار چھپ جانے کے بعد راقم پر ندامت کا غلبہ ہوا اور چند ہفتے علامہ کی خدمت میں حاضری کی جرات نہ کر سکا لیکن جب آخر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا تو علامہ کے طرزِ تپاک اور محبت آمیز سلوک میں کوئی فرق نہ آیا تھا بلکہ وہ شاکی تھے کہ اتنی مدت تک ملنے کیوں نہ آئے۔

مبارکباد پارٹی عطائے خطاب پر علامہ اقبال کو مسلم، ہندو، سکھ معززین لاہور کی طرف سے مقبرۂ جہانگیر (شاہدرہ، لاہور) میں ایک شاندار پارٹی دی گئی جس میں پنجاب کے تمام سرکاری و غیر سرکاری عمائد و حکام شامل ہوئے۔ اقبال نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کی اور اس میں یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام "پیامِ مشرق" ہو گا۔

اکتوبر ۲۳ء میں پنجاب ہائی کورٹ کا افتتاح وائسرائے نے کیا۔ چیف جسٹس سر شادی لال کی تقریر کے بعد وائسرائے نے اس کا جواب دیا، اس جواب میں انھوں نے نہایت ہی شاندار الفاظ میں اقبال کی تعریف کی۔[۲]

۱۔ اقبال نامہ عطاء اللہ ۲۰۶   ۲۔ شاد اقبال

پس منظر بعد میں حضرت علامہ اور ان کے بعض گہرے دوستوں سے عطائے خطاب کا پس منظر تفصیل سے معلوم ہوا۔ ہمارے نزدیک صحیح ترین قصہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اس زمانے کے چیف جسٹس سر شادی لال نے علامہ کو بلا کر ان سے کہا کہ حکومت نے مجھ سے خطابات کے لئے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں آپ کے لئے "خان صاحب" کے خطاب کی سفارش کر رہا ہوں۔ علامہ نے بگڑ کر کہا کہ میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں ہوں۔ آپ ہرگز سفارش کی زحمت نہ فرمائیں۔ سر شادی لال نے کہا کہ اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے مزید غور کر لیجئے۔ علامہ نے فرمایا "میں غور کر چکا ہوں۔ مجھے خطاب کی ضرورت نہیں"۔

دو تین دن بعد سر شادی لال نے علامہ کو بلا بھیجا۔ آپ نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ اگر خطاب کے سلسلے میں گفتگو کرنا مقصود ہے تو میرا جواب آپ کو معلوم ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ ہاں اگر کوئی اور بات کرنی ہو تو میں حاضر ہو جاؤنگا۔

اس زمانے میں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن تھے جن سے نواب ذوالفقار علی خاں کے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے گورنر صاحب سے ذکر کیا کہ مشہور بنگالی شاعر ٹیگور کو خطاب مل چکا ہے لیکن اقبال جو بہت بڑے شاعر اور مسلمانوں کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں، اب تک قدر دانی سے محروم ہیں۔ گورنر نے کہا "بہت اچھا انہیں خان بہادر بنا دیا جائے گا"۔ نواب صاحب نے کہا کہ یہ اقبال کی ہتک ہے۔ پھر گورنر نے کہا کہ شمس العلماء کیسا رہیگا؟ نواب صاحب نے فرمایا "یہ بھی مناسب نہیں"۔

لتے ہیں ایک دن گورنر پنجاب نے علامہ کو گورنمنٹ ہاؤس میں دعوت دی، جب علامہ وہاں پہنچے تو گورنر نہایت تپاک سے ملے اور بتایا کہ لندن ٹائمز کے ایک مشہور مقالہ نگار آئے ہوئے ہیں اور میرے ہی پاس مقیم ہیں، وہ آپ کی ملاقات کے بعید خواہاں تھے اس لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔ اس مقالہ نگار نے اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا٭ اور مشرق وسطیٰ کے جن جن ملکوں میں گیا تھا، ان کے علمی وادبی حلقوں میں علامہ کے کمالات کا چرچا بھی سن آیا تھا، اس کے علاوہ اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کے متعلق علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ صحبت دو تین گھنٹے تک جاری رہی، آخر میں سر ایڈورڈ میکلیگن نے علامہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کے لیے سر کے خطاب کی سفارش کروں۔ علامہ نے انکار کیا اور کہا کہ میں خطابات اور اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ علامہ نے دیکھا کہ ان کے انکار سے گورنر کی طبیعت مکدر سی ہو گئی ہے اور یہ قدرتی بات تھی اس لیے کہ ملک کے عوام میں سیاسی لیڈروں نے خطابات کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی اور لوگ عام طور پر خطاب کو غیر ہر دلعزیزی کا سامان سمجھنے لگے تھے۔ گورنر سمجھے کہ اقبال بھی اس معاملہ میں عوام ہی کے ہم خیال ہیں لیکن جب علامہ نے کہا کہ اگر آپ کے

٭ اس وقت تک پروفیسر نکلسن کا ترجمہ اسرار خودی شائع ہو چکا تھا مشہور نقاد ای۔ ایم فارسٹر نے اس پر مشہور علمی صحیفے اتھینیم میں مفصل تنقید لکھی تھی، اس کے علاوہ کیمبرج کے پروفیسر ڈکسن نے نیشن میں بھی تبصرہ لکھا: غرض علامہ کا نام اور ان کا فلسفہ مغرب کے علمی حلقوں میں خاصا متعارف ہو چکا تھا، صرف ہندوستان کے فرنگی حکمران ہی علامہ اقبال سے بے خبر تھے۔

اصرار ہے تو خیر، یوں ہی سہی تو گورنر صاحب کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

شمس العلماء اس کے بعد میکلیگن نے علامہ سے دریافت کیا کہ آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلماء کے خطاب کیلئے موزوں ہے؟ علامہ نے فرمایا: میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے، کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔ میکلیگن نے کسی قدر تامل کے بعد شرط قبول کرلی۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے بہترین مستحق ہیں۔ میکلیگن نے کہا: میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے، کیا انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں؟ علامہ نے فرمایا کہ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں، وہ میرے استادِ محترم ہیں۔

اس موقع پر علامہ نے گورنر کو خوب سمجھا دیا تھا کہ شاہ صاحب سرکار دربار کے قصے نہیں جانتے اس لئے ایسا بندوبست فرمائیے گا کہ اعلانِ خطاب کے بعد ان کو سیالکوٹ سے لاہور آ کر کسی رسم میں حصہ نہ لینا پڑے! چنانچہ جب خطاب کا اعلان ہوا تو سر ایڈورڈ میکلیگن نے مولوی صاحب کی سند خطاب ان کے صاحبزادے سید علی نقی شاہ کے حوالے کر دی جو گورنمنٹ ہاؤس ہی میں ڈاکٹر کے عہدے پر مامور تھے![1]

۱۔ ماخوذ از "روزگار فقیر" (کرزن فقیر سید وحید الدین)۔

میاں عبدالعزیز کی خاطر دست بردار

علامہ کے احباب اور دوسرے نیاز مند ہمیشہ انھیں پنجاب کونسل میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انتخابات کا وقت آیا تو دوستوں نے اصرار کیا، اخباروں نے اپلیں شائع کیں، عوام نے وفود بھیجے؛ غرض ان کو بیحد مجبور کیا گیا کہ وہ لاہور سے کونسل کی ممبری کے لیے امیدوار کھڑے ہو جائیں لیکن چونکہ اسی حلقہ سے میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا، کی امیدواری کا اعلان ہو چکا تھا اور علامہ سے میاں صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے اس لیے علامہ کی مروت نے ان کے مقابلے میں کھڑے ہونا گوارہ نہ کیا!

۱۹۲۳ء ہی کا ذکر ہے کہ علامہ کی لدھیانہ والی بیگم کا انتقال ہو گیا، ان کے بچہ پیدا ہونے والا تھا کسی اندرونی پیچیدگی کی وجہ سے فوت ہو گئیں۔ لدھیانہ کے بڑے قبرستان میں مرحومہ کی لوحِ قبر پر اقبال کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ کندہ تھا، غالباً اب تو وہ قبرستان ہی صاف ہو چکا ہوگا۔[۱]

المبطون شہید (حدیث)

اے دریغا از مرگ ہم سفرے	دل من در فراق او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم	سخن پاک مصطفےٰ آورد
بہر سال رحیل او فرمود	بہ شہادت رسید و منزل کرد
(اقبال)	۱۳۴۳ھ

۱: امروز: اقبال نمبر، ۲۲ اپریل ۵۰ء

پیامِ مشرق

یکم مئی ۱۹۲۳ء کو "پیامِ مشرق" شائع ہو گئی جو جرمنی کے نامور شاعر گوئٹے کے "دیوانِ مغرب" کے جواب کے طور پر لکھی تھی اور علامہ تین چار سال سے اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں چودھری محمد حسین ایم۔اے نے اس کتاب کے تعارف کے لئے رسالہ "ہزار داستان" میں ایک مفصل مضمون لکھا جو ۷ اپریل کے "زمیندار" میں نقل کیا گیا چونکہ اس زمانے میں "زمیندار" کی ادارت سالک اور مہر کے سپرد تھی اور ان دونوں کو حضرت علامہ کی شخصیت سے خاص محبت اور ان کی علمی جلالت قدر سے مخصوص عقیدت تھی اور ان کی تعلیمات و نشر و اشاعت کے لئے مخلصانہ جوش رکھتے تھے اس لئے "زمیندار" میں علامہ کی تصانیف کے متعلق اطلاعات اور ان پر تنقیدی و تقریظی مقالات اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ خود حضرت علامہ بھی بحد شفقت فرماتے تھے اور کبھی کبھی "زمیندار" کو اپنے غیر مطبوعہ کلام سے بھی مشرف فرماتے رہتے تھے۔

دو ترک فوجی لاہور میں

اب تک علامہ اقبال کی تین کتابیں "اسرارِ خودی"، "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" بزبان فارسی شائع ہو چکی تھیں اور آپ کے کمالات کے غلغلے سے ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کی فضائیں بھی لبریز ہو رہی تھیں، اتحادِ عالم اسلامی کا جذبہ روز افزوں ہو رہا تھا، مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے مردِ بیمار میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑا دی تھی، لوزان کے مقام پر عصمت پاشا کی تدبیر نے لارڈ کرزن کی سیاست کو شکست دے کر ترکوں کے لئے آبرومندانہ زندگی کا سر و سامان بہم

پہنچا دیا تھا۔ انھیں دنوں ترکان احرار کی طرف سے دو متین و سنجیدہ فوجی ترک افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئے، اس وقت ترکان احرار سلطان وحید الدین معزول کی جگہ عبدالمجید خاں کو خلیفۃ المسلمین نامزد کر چکے تھے۔ میجر حیدر عصمت بے اور لفٹنٹ الیاس آفندی اوائل فروری ۱۹۲۴ء میں وارد لاہور ہوئے، یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ان بھائیوں کی پزیرائی میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ یہ دونوں مجاہد نیڈوز ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں بھی ہر وقت مسلمانوں کا ہجوم رہتا تھا لیکن یہ دونوں علامہ اقبال کا نیاز حاصل کرنے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ علامہ کی طبیعت کل ناساز تھی لیکن آج وہ اندرون لاہور آپ لوگوں کی رسم پزیرائی کی ایک تقریب میں تشریف لارہے ہیں۔ چنانچہ رنگ محل مشن سکول لاہور کے سامنے نوجوانانِ اسلام نے مہمانانِ محترم کی دعوت و ضیافت کا انتظام کیا، کوچہ چابک سواراں میں محرابیں بنی ہوئی تھیں، بینڈ باجا خیر مقدم کا ترانہ بجانے کے لئے مستعد تھا اور علامہ اقبال، مولوی محبوب عالم، مرزا جلال الدین، حاجی شمس الدین، مدیرانِ "انقلاب" اور دوسرے ممتاز حضرات نے مہمانوں کا استقبال کیا، یہ دونوں ترک مجاہد حضرت علامہ کے ادب و احترام میں بچھے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اپنے تمام ترک بھائیوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے حضرت علامہ کی زیارت کی ہے![۱] اس سے کچھ عرصہ بعد ہی مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو منسوخ اور عبدالمجید خاں کو خارج البلد کر دیا۔

۱۔ "زمیندار"، ۷ فروری ۱۹۲۴ء

کمالی اصلاحات مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں جو معاشرتی اصلاحات نافذ کیں، ان کی عمومی روحیت سے تو علامہ اقبال مطمئن تھے لیکن بعض تفصیلات سے شدید اختلاف رکھتے تھے مثلاً ان کو اس امر سے اتفاق نہ تھا کہ وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے برابر ہو، چنانچہ انھوں نے اپنے انگریزی لیکچر "اسلام کے اصول حرکت" میں اس مسئلے پر خاص بحث کی ہے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ علامہ نے ایک دفعہ فرمایا مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی اصلاحات کو محض بلند آہنگی اور ہنگامہ آرائی کے باعث دنیائے اسلام میں غیر مقبول بنا دیا حالانکہ اگر وہ ان اصلاحات کے لیے قرآن حکیم سے اصول اساسی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو قرآن انھیں ضرور صحت مند بنیادیں مہیا کر دیتا اور قرآن کی بنیاد پر ہونے والی اصلاحات دنیائے اسلام کے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوتیں۔

بانگِ درا مارچ ۱۹۲۴ء میں علامہ کی کتاب "پیام مشرق" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا یعنی ملک میں شعر فارسی کا چرچا نا کافی ہونے کے باوجود آٹھ دس مہینے کی مدت میں ایک ایڈیشن ختم ہو گیا، دوسرے ایڈیشن میں متعدد ایسی نظمیں بھی شامل کی گئیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ علامہ اقبال اپنے دوستوں اور مداحوں کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے اردو کلام کا مجموعہ بھی مرتب کر رہے ہیں[۱]، چنانچہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں "بانگ درا" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، اور ملک میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ "بانگ درا"

۱۔ "زمیندار" ۷ ستمبر ۱۹۲۴ء

کی ترتیب پر علامہ نے کوئی چار مہینے صرف کیے۔ بہت سی نظمیں نظر انداز کر دی گئیں۔ یعنی مجموعہ میں شامل کرنے کے قابل نہ سمجھی گئیں۔ بعض نظموں کے اکثر اشعار قلم زد کرکے صرف چند اشعار باقی رکھے گئے اور بعض پرانی نظموں کے بعض مصرعوں اور شعروں کے الفاظ بدل دیئے گئے۔ حالانکہ وہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ چکے تھے۔

اس وقت تک نواب ذوالفقار علی خاں انجمن حمایت اسلام کے صدر اور علامہ اقبالؒ اس کے سیکرٹری چلے آتے تھے۔ لیکن مئی ۱۹۲۴ء میں جب نئے عہدہ داروں کا انتخاب ہونیوالا تھا، ان دونوں حضرات نے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا۔ ۱۲ مئی کو نیا انتخاب ہوا، علامہ اقبالؒ انجمن کے صدر اور خان صاحب شیخ عبدالعزیز (ڈپریس برانچ) سیکرٹری منتخب ہوئے!

سلطان ابنِ سعود

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابن سعود خاندانِ شریفی کو حجاز سے بیدخل کر کے خود قابض ہو چکے تو ملک میں حجاز کے مستقبل کے متعلق طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ بعض یہ کہہ رہے تھے کہ حجاز میں جمہوری حکومت ہونی چاہیئے؛ وہاں شاہ و سلطان کا کوئی کام نہیں، بعض کا خیال تھا کہ حجاز پر تمام عالمِ اسلامی کے نمائندوں کی ایک کمیٹی حکومت کرے اور اس کمیٹی کا صدر رئیسِ مملکت سمجھا جائے۔" "زمیندار" اخبار اور بیشمار اہلِ علم و فکر کی رائے یہ تھی کہ حجاز کے حسنِ انتظام کے لیے سلطان ابنِ سعود پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور ایک مسئلے کو جو سلجھ گیا ہے، خواہ مخواہ از سرِ نو الجھانا مناسب نہ ہوگا۔ "مسلم آؤٹ لک" (انگریزی روزنامہ) کے ایڈیٹر مسٹر ڈاؤ واپسن نہایت

ا: "زمیندار" ۲۲ مئی ۱۹۲۴ء

پرجوش نومسلم انگریز تھے اور علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے، انھوں نے مسئلہ حجاز کے بعض اکابر کی رائیں حاصل کرکے اپنے اخبار میں شائع کیں۔

علامہ اقبالؒ کے خیالات

اسی سلسلے میں علامہ اقبال سے بھی انٹرویو کیا، "مسلم آوٹ لک" ایک تجویز پیش کرچکا تھا کہ سابق خلیفۃ المسلمین عبدالمجید خان کو حاکم حجاز بنا دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ دنیائے اسلام میں ان کی شخصیت کو بہت احترام و اعتماد حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ یہ تجویز نامناسب ہے، اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو دنیائے اسلام میں مزید الجھنیں پیدا ہو جانیکا اندیشہ ہے کیونکہ ابن سعود وہابیوں کا نمائندہ ہے اور عبدالمجید خاں سنی دنیا کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں؛ اس تجویز سے مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے درمیان کش مکش کا خطرہ ہے۔

مزید استفسارات کے جواب میں علامہ نے فرمایا "میں حجاز کی صورتحال سے پوری طرح مطمئن ہوں اور سلطان ابن سعود پر بدون تذبذب اعتماد رکھتا ہوں سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان سے ملے ہیں، وہ میری اس رائے کے مؤید ہوں گے۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب "اسلام" میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سرزمین نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کا صاف ترین اور پاک ترین خطہ بتاتا ہے" اس کے بعد آپ نے فرمایا "ممکن ہے عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشو و نما پا جائے اور اس کے آثار ابھی سے نظر آرہے ہیں، ہمیں اس احساس خودی کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے اگرچہ اس کی تہ میں تجرد و تفرد کی نشو و نما کا بھی اندیشہ ہے لیکن ہمیں کچھ مدت تک

اس تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سرزمینِ عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک پھل پھول نہیں سکتی؟

خلیفہ عبدالمجید خاں اور تبلیغ

علامہ اقبالؒ نے ایک نہایت دلفریب تجویز پیش کی، آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمان سابق خلیفہ عبدالمجید خاں سے کوئی کام لینا چاہیں تو انھیں چاہیئے کہ بغرض تبلیغ اسلام ایک وسیع بین الاقوامی تنظیم قائم کریں اور خلیفۂ سابق کو اس تنظیم کا رئیسِ اعلیٰ مقرر کریں۔ تمام اسلامی دنیا اس تنظیم کو مالی امداد دے، مبلغین کی ایک وسیع بین المللی تبلیغی درس گاہ قائم کی جائے، اسلام کے محاسن کو دنیا پر روشن کرنے کے لیے تبلیغی لٹریچر تمام زبانوں میں شائع کی جائے، میرے نزدیک خاندان عثمان کے اس آخری خلیفہ کی شخصیت اس تنظیم کی کامیابی کی بہت بڑی ضامن ہو گی!

۱۹۲۴ء میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ۳۰ اکتوبر کو بھاٹی دروازہ اسلامیہ ہائی سکول میں منعقد ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سید طفیل احمد اور بعض دوسرے اکابر شریک ہوئے! اس میں علامہ اقبال نے اپنے وہ چند اشعار سنائے جن میں پہلا شعر یہ ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری

چونکہ قوم کا مذاق از سر تا پا سیاسی ہو چکا تھا، سیاسی قیادت مسلمانوں پر قابض

۱ے "زمیندار" ماخوذ از مسلم آؤٹ لک ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء

تھی اس لیے انجمن ہمیدکسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی اور اس کے سالانہ اجلاس بھی محض بغرض خانہ پری، ہی منعقد ہوتے تھے، تحریک خلافت سے قبل کا جوش و خروش مفقود تھا، مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کا بیان ہے۔ ایک دفعہ میں کراچی گیا ہوا تھا، وہاں جسٹس شادی لال موجود تھے، ان سے باتیں ہوئیں تو کہنے لگے: مرزا صاحب! میاں شفیع اقبال کو بہت سخت سست کہا کرتے ہیں اور ہر جگہ ان کے کردار پر حملے کرتے پھرتے ہیں۔

عدالتِ عالیہ کی ججی

یہ بات اقبال کے مستقبل کے لیے بہت مضر ہے، اگر وہ میرے ساتھ مل کر کام کریں تو بہت ہی اچھا ہو۔ جب میں نے لاہور واپس آکر علامہ اقبال سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگے "مرزا صاحب! شادی لال کا اپنا ذاتی مطلب ہے، وہ میاں فضلی کا حریف ہے اور بعض مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اس خاندان کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم ان لوگوں کے جھگڑوں میں الجھیں! ہم شادی لال کا ساتھ نہیں دے سکتے"۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۵ء میں سر شادی لال چیف جج بنے، ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا اور صوبے کی اسلامی انجمنوں، وکیلوں، اخباروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لاء کو ان کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالتِ عالیہ کا جج مقرر کیا جائے [۱]۔ تو انھیں سر شادی لال نے علامہ اقبال کے متعلق یہ ظاہر کی "ہم اقبال کو

۱۔ "زمیندار"، ۹۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون داں کی حیثیت سے نہیں"، چنانچہ علامہ جج نہ ہو سکے اور ان کی جگہ یو۔ پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔

استفتا بابت علامہ اقبال یہ وہ زمانہ تھا جب ترک موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگٹھن کا جوش و خروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارات منظم کر رہے تھے! پھر سلطان ابن سعود کی تطہیر حجاز کے غلغلے نے ہندوستان میں مسلمانوں کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان سخت کش مکش ہو رہی تھی، دونوں طرف سے علماء نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا علامہ اقبال سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے اور بدعتی علماء ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے؛ اتنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی، اس نے ایک استفتا مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لیے بے حد مشہور تھے؛ چنانچہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے۔ اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام "پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری" تجویز کیا اور یہ استفتا لکھا:

> کیا فرماتے ہیں علماء دین اور حامیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبرؑ سے استہزا کرے، علماء کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے اور انھیں بُرے خطابات سے یاد کرے،

ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں "امام" اور "چراغِ ہدایت" کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا و جروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں:

آفتاب

۱۔ اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے ۔۔۔ چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو ۔۔۔ یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو ۔۔۔ زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری ۔۔۔ آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

(ترجمہ گایتری منتر)

۲۔ کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

۳

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

۴۔ غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

۵. رام کی تعریف میں فرماتے ہیں:

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

فتوےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسم پروردگار اور یزدان عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں؛ اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے. علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر ہے اور توہینِ موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگانِ دین بھی فسق لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کردیں ورنہ

سخت گناہ گار ہوں گے۔ ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خاں المرحوم!

اس فتوی پر ملک بھر میں شور مچ گیا، مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی نے "زمیندار" میں اس جاہلانہ فتوے کی دھجیاں اڑا دیں۔ خود "زمیندار" نے فتوی پر تبصرہ کیا، ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چودھری محمد حسین، ایم اے) نے ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا یعنی اشعار منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علماء اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشقِ رسولؐ، دردمندِ ملت، حامیٔ دینِ اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟[۱]

حضرت میاں شیر محمدؒ اور اقبالؒ

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے معلوم ہوا کہ علماء و مشائخ کے طبقے میں جو اہلِ دل ہیں وہ انتہائی پابندیٔ شریعت کے باوجود علامہ اقبال کے پایہ شناس ہیں لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک بزرگ میاں شیر محمدؒ رہتے تھے (چند سال ہوئے انتقال ہو گیا)، نہایت نیک، پرہیزگار اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، احترام شریعت پر بیحد مصر تھے اور جو لوگ

۱؎ "زمیندار" ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء

ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، انھیں داڑھی رکھنے کی سخت تاکید کیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کو متقی اور پرہیزگار بزرگوں سے ملنے کا ہمیشہ ہی سے شوق تھا، ایک دن وہ میاں شیر محمد کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، میاں صاحب مسجد میں بیٹھے تھے پوچھا کیسے آئے؟ اقبال نے کہا: میرے لئے خدا سے دعا کیجیے۔ میاں صاحب نے فرمایا: تم داڑھی منڈواتے ہو میں تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتا: مجلس دم بخود رہ گئی۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چلے۔ اڈا ذرا دور تھا! دہ حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے حضرت میاں صاحب سے پوچھا آپ نے پہچانا یہ شخص کون تھا فرمایا: نہیں"! وہ کہنے لگا۔ ڈاکٹر اقبال یہ سن کر حضرت میاں صاحب کی عجیب حالت ہوئی مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے۔ علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے، بعد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو داڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہوں، لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کر دیئے ہیں، داڑھی کے معاملہ میں سختی کرنا مناسب نہیں اس کے بعد علامہ کے لئے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے۔

نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کانفرنس

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے فسادات کا زمانہ تھا، اس دوران میں مختلف قوموں کے لیڈروں نے فسادات کو روکنے اور امن و اتحاد کو قائم کرنے کی غرض سے کانفرنسیں

بھی کیں، اسی غرض سے بعض مخصوص اور ہنگامی جماعتیں بھی قائم ہوئیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ لاہور میں 'نیشنل لبرل لیگ' کے نام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک انجمن قائم کی گئی، علامہ اقبال بھی اس میں شامل ہوئے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مستعفی ہو گئے، اس کے بعد مسٹر چنتامنی نے بھی اسی قصد سے بمبئی میں ایک نیشنلسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے داعیوں میں نام درج کرنے کے لیے علامہ اقبال سے اجازت طلب کی۔ علامہ نے اجازت دے دی، اس پر بعض احباب نے سوال کیا کہ نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کی کانفرنس کے متعلق آپ کے رویے کی کیا علت ہے؟

علامہ اقبال نے ایک بیان شائع کیا جس میں بتایا گیا کہ:۔

پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرمناک حالات پیدا ہو رہے ہیں اور صوبے کی فضا جیسی کدر ہو رہی ہے، اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح رہیں۔ اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پیش نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے تاہم اخلاقی اعتبار سے اس میں شرکت کرنا اپنا فرض جانتا ہوں!

چنانچہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہرِ مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصولِ مقصد کے امکانات بہت کم ہیں، اس بنا پر میں نے اس جماعت سے استعفا دیدیا۔

اس کے بعد چنتامنی کی ڈسٹرکٹ کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میری مراد کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت نہ تھی، نہ چنتامنی کے تار میں ایسے الفاظ تھے جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا جلسہ کسی سیاسی جماعت کے لیے ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے جلسے کا مقصود بالخاصہ "سوراجی جماعت" کی مخالفت تھا۔

میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعثِ ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاقی اور معاشری زندگی کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں، ہاں اہلِ ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کی ساتھ ہوں![1]

اس بیان کے اقتباسات درج کرنے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ علامہ اقبال ہندوستانی سیاسیات میں اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ رکھنے کے باوجود ملک کی مختلف

۱۔ روزنامہ "زمیندار" مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۶ء

جماعتوں کے درمیان صلح و امن کے بیحد خواہشمند تھے اور اس مقصد کے حصول کی کوشش بلا امتیاز مذہب و سیاست ہر شخص کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ رہتے تھے لیکن ان کو ہمیشہ یہ ہی تجربہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن و مصالحت کی کوششوں کے پردے میں ہر لیڈر اپنا یا اپنی قوم کا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے، محض نفس مصالحت کے لیے کسی کے دل میں دردمندانہ خواہش موجود نہیں۔

کونسل کے انتخاب میں کامیابی

اپریل ۱۹۲۶ء کے اواخر میں علامہ اقبال رح نے احباب کے اصرار پر حامی بھرلی کہ وہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے آئندہ انتخاب میں بطور امیدوار کھڑے ہوں گے؛ چنانچہ قرار پایا کہ آپ شہر لاہور ہی کے مسلم حلقے کی طرف سے کھڑے ہوں۔ اگرچہ اخبارات نے پیہم یہ لکھا کہ علامہ کی شخصیت اس قدر جلیل القدر ہے کہ ان کو بلا مقابلہ کونسل کا ممبر ہو جانا چاہیے؛ لیکن لاہور میں جاہ پرستی اور برادری نوازی کا مرض عام ہونے کی وجہ سے دو تین حضرات مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ بہرکیف افہام و تفہیم کے بعد دو امیدواروں نے تو اپنے نام واپس لے لیے لیکن خان بہادر ملک محمد دین آخر تک ڈٹے رہے؛ چنانچہ علامہ اقبال رح کو انتخاب کی جنگ لڑنی پڑی۔ یہ عجیب جوش و خروش کے دن تھے؛ لاہور کے ہر محلے میں علامہ کے نیازمند اور مداح جلسے منعقد کر رہے تھے، شہر کی تمام برادریاں علامہ کی حمایت میں پمفلٹ شائع کر رہی تھیں۔ جو لوگ ملک محمد دین کے لیے کام کر رہے

ا۔ "زمیندار" مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۶ء

تھے، ان میں بھی اکثر ایسے تھے جن سے علامہ کی جلالت قدر اور عظمت علمی ہرگز پوشیدہ نہ تھی مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولوی محرم علی چشتی لیکن وہ بڑے بنا رسی کا برا ہو جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو رہی تھی۔ علامہ کے نیاز مندوں کی کوشش یہ تھی کہ حتی الامکان علامہ کا پیسہ خرچ نہ ہو؛ چنانچہ علامہ معمولی سی رقم صرف کرکے اپنے حریف کے مقابلہ میں تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے اور ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو "ایم۔ ایل۔ سی" بن گئے!

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ انتخاب میں علامہ کی کامیابی پورے صوبے کے لئے باعث مسرت تھی؛ چنانچہ بعض مقامات سے ان کو دعوتیں موصول ہوئیں کہ تشریف لائیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تصدیق حسین خالد فیروزپور میں ای اے سی تھے اور علامہ سے گہری عقیدت تھی، ان کی تحریک پر معززین فیروزپور نے علامہ کو "استقبالیہ" دینے کا فیصلہ کیا اور کہلا بھیجا کہ یہاں آپ کا جلوس نکالا جائیگا اس کے بعد آپ کو ایک مشاعرے کی صدارت کرنی ہو گی اور شام کو گارڈن پارٹی دی جائے گی۔ علامہ نے فرمایا میں جلوس میں ہرگز شامل نہ ہوں گا، یہ میرے ذوق کے خلاف ہے؛ مشاعرے کی صدارت میری جگہ سالک صاحب کریں گے البتہ گارڈن پارٹی میں شریک ہو جاؤں گا۔

چنانچہ یہی ہوا، جلوس کے انتظامات منسوخ کر دیئے گئے، راقم کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس میں پنڈت تلوک چند محروم، مولانا تاجور، میلا رام وفا، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، منوہر سہائے انور وغیرہم شریک تھے، گارڈن پارٹی میں علامہ شامل

ا۔ نیرنگ خیال اقبال ۴۰۔ ملفوظات اقبال ۶۷۔

ہوئے! حاضرین کے اصرار پر تقریر کی لیکن انگریزی میں، جب کلام سنانے کی فرمائش ہوئی تو انکار کر دیا اور کہا شعر سننے سنانے کی چیز نہیں، تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے کی چیز ہے۔ معززین فیروز پور نے راقم سے کہا کہ آپ سفارش کر دیجیے۔ میں نے منت سماجت کی تو فارسی کے یہ دو شعر سنائے:

دریں صحرا گزار افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نالہ ہائے سار بانے را
اگر یک یوسف از زندانِ فرعونے بروں آید
بشارت می تواں بردن متاعِ کاروانے را

٭

تیسری فصل

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک

یوں تو اس سے قبل بھی نظریاتی اعتبار سے علامہ اقبال مسلمانانِ ہند کی سیاسیات میں خاصا موثر حصہ لے رہے تھے لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد تو آپ عملی سیاسیات کے خارزار میں بھی گامزن ہوگئے۔ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک شاہی کمیشن کا اعلان ہوا جس کے صدر سر جان سائمن کے نام پر اس کو سائمن کمیشن کہتے تھے۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر اہل ہند اپنے ملک کے لئے ایک آئین متحدہ طور پر تیار کر لیں تو ہم اس کو قبول کر کے نافذ کر دیں گے۔ اس پر کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے نہرو رپورٹ مرتب کر لی گویا اپنی طرف سے ایک متحدہ آئین پیش کر دیا۔ لیکن چند ہی روز میں مسلم لیگی حلقوں نے تو درکنار خود مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند نے جو کئی سال سے کانگرس کا دم بھرا کرتی ہوئی تھیں، نہرو رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سے قبل گاندھی جی نے دہلی میں مسلمان رہنماؤں کو گفتگو کی دعوت دی، علامہ اقبال بھی تشریف لے گئے۔ جب گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اگر مسلمانان

ہند متفقہ طور پر اپنے مطالبات معین کر دیں تو کانگرس ان کو منظور کر لے گی، اس پر علامہ نے فرمایا کہ یہ تو آپ نے بالکل لارڈ برکن ہیڈ کی سی بات کی، اس پر گاندھی جی ہیچ و پیچ کھائے اور ان سے کوئی جواب نہ بن آیا۔

مسلمان اور مقاطعہ

کانگرس نے سائمن کمیشن کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ملا کہ ہندوستانیوں میں فرقہ وار اختلاف اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے نمائندوں کو کمیشن میں شامل کرنا محال ہے۔ اس موقع پر نواب ذوالفقار علی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا جس میں یہ لکھا کہ "رائل کمیشن میں ہندوستانی ممبروں کے مقرر نہ کرنے کے وجوہ لارڈ برکن ہیڈ نے بیان کیے ہیں، فرقہ وار اختلافات ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم ان وجوہ کو بادل ناخواستہ قبول کر لیں، ہندو مسلمانوں کے مشترکہ پروگرام سے پہلے فرقہ وار اختلافات کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ کمیشن کو بائیکاٹ کرنے سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔"[۱]

"انقلاب" مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۲۷ء میں کمیشن کے متعلق علامہ اقبال کا ایک انٹرویو شائع ہو چکا تھا جس میں انھوں نے کمیشن کی ترکیب پر اظہار افسوس کیا لیکن اس کا ذمہ دار ہندوستانیوں کے اختلافات کو ٹھہرایا، کمیشن کے بائیکاٹ کی مخالفت کی اور اس امر پر زور دیا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ حقوق نہ ہوگا، ملک ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے گا۔ اس زمانے میں "انقلاب"

۱۔ "پیسہ اخبار" ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء

نہایت زور شور سے تصفیہ حقوق پر پُر زور مقالات لکھ رہا تھا اور علامہ اقبال کی اعانت و سرپرستی اس کو بوجہ اتم حاصل تھی۔ زمیندار نے کانگرس کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور اس میں آئے دن انقلاب' اس کے مدیروں اور خود علامہ اقبال کے خلاف زہریلے مقالات چھپ رہے تھے۔

مولانا گرامی کا انتقال

۱۹۲۷ء میں ۳۰ مئی کو علامہ اقبال کے مخلص دوست، فارسی کے شیوابیان شاعر مولانا غلام قادر گرامی (شاعر خاص حضور نظام) کا انتقال ہو گیا، علامہ کو ان کے انتقال سے بیحد صدمہ ہوا۔ انھوں نے اس حادثے پر ذیل کے چند اشعار لکھے جو انقلاب' کے صفحہ اوّل پر شائع ہوئے:

آہ مولانا گرامی از جہاں بر بست رخت — آنکہ ز فکر بلندش آسماں را پشت پائے
معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر — مثل حورے بی حجاب اندر بہشتے دلکشائے
از نوائے جانفزائے او عجم را زندگی — جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمائے
یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتم — اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنائے
بر مزارش بیست تر کن پردہ ہائے ساز را — تا نہ گرد د خواب او آشفتہ از شور نوائے

سیاسیات کا رنگ

ملکی سیاسیات کا رنگ یہ تھا کہ ایک طرف مختلف مقامات پر ہندو اور مسلم عوام کے درمیان ذبیحہ گاؤ، مسجد کے سامنے باجا بجانے اور جلوس نکالنے اور شدھی اور تبلیغ کے سلسلے میں فسادات ہو رہے تھے اور دوسری طرف دونوں قوموں کو رہنما دستوری مسائل کے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے ہندو اور ان کے

نیشنلسٹ مسلمان ساتھی مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور مسلمان لیڈر جداگانہ انتخاب پر زور دے رہے تھے ہندو لیڈر مسلمانوں کو وہ زائد از استحقاق نشستیں دینے پر آمادہ نہ تھے جو میثاق لکھنؤ میں منظور کی گئی تھیں بشکل یہ تھی کہ بعض مسلم لیگی قائدین بھی جن میں مسٹر محمد علی جناح بھی پیش پیش تھے، مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر آمادہ تھے، جب مارچ ۲۷ء میں دہلی کے مقام پر زیر صدارت مسٹر جناح مسلم ارکان اسمبلی اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں یہ تجاویز منظور کی گئیں کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ قرار دیا جائے صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دی جائیں، پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلم اکثریت محفوظ و مسلم قرار دی جائے، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے، اگر یہ تجاویز قبول کر لی جائیں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے. مئی ۲۷ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور دسمبر ۲۷ء میں ڈاکٹر انصاری کے زیر صدارت کانگرس کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس میں ان تجاویز کو منظور کر لیا گیا مسلم لیگ نے بھی ۳۰ دسمبر کے اجلاس میں ان تجویزوں کی تصدیق کر دی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ان تجاویز کے سرگرم حامی تھے لیکن سر محمد شفیع اور ان کے رفقائے مسلم لیگ کی اس مخلوطی "پالیسی" سے اختلاف کیا اور لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی: ایک کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور سیکرٹری ڈاکٹر کچلو قرار پائے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال مقرر ہوئے.

علامہ کبھی قابو میں نہ آئے

مولانا محمد علی، سر محمد شفیع سے تو مایوس تھے،

لیکن علامہ اقبال کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ انھیں اپنا ہم خیال بنا کر دہلی تجاویز کی حمایت پر آمادہ کر سکیں گے۔ چنانچہ مولانا لاہور آئے اور مولانا عبدالقادر قصوری کی وساطت سے علامہ پر دو ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ مقصود یہ تھا کہ علامہ بھی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے حامی بن جائیں۔ علامہ نے فرمایا کہ اگر ہندو اور کانگرس لیڈر مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر کے ان سے سمجھوتہ کریں تو میں کمیشن سے تعاون نہیں کروں گا بلکہ سر محمد شفیع کو بھی مقاطعے پر رضامند کر لوں گا۔ مولانا حسرت موہانی بھی علامہ کے نقطۂ نگاہ کے حامی تھے لیکن چونکہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مطالبات پر آمادہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے مولانا محمد علی علامہ کو رضامند نہ کر سکے۔

گول میز کانفرنس

کانگرس نے ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کر کے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ مسٹر جناح والی مسلم لیگ کو دستور کے اس خاکے کی بعض دفعات سے اختلاف ہوا۔ اس پر نہرو کمیٹی مقرر کی گئی جس کی رپورٹ کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ اس موقع پر مزید تفصیلات کی ضرورت نہیں، مختصر یہ کہ ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اپنی کانفرنسیں منعقد کر کے سیاسیات ہند پر اپنے نقطہ ہائے نگاہ پیش کیے۔ کانگرس نے اگرچہ بظاہر سائمن کمیشن سے مقاطعہ کیا لیکن اندر ہی اندر اس کو نہرو رپورٹ کی کاپی بھیج کر لکھ دیا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق اہلِ ہند کے زیادہ سے زیادہ اہل الرائے طبقوں کا اتفاق اسی دستاویز پر ہے۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن نے مختلف نقطۂ نگاہ کے نمائندوں کی

شہادتیں لے کر اپنا کام مکمل کر دیا اور اکتوبر ۲۹ء میں لارڈ ارون وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے آئندہ آئین کی ترتیب کے لئے برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے والی ہے۔

سیکرٹری شپ سے استعفا

سر محمد شفیع اور دوسرے حضرات کے ساتھ علامہ اقبال کی شرکت کار حقیقت میں ملک و قوم کی مخصوص سیاسی کیفیت کا نتیجہ تھی، ورنہ فی الحقیقت علامہ کی طبیعت کا آدمی رجعت پسند طبقوں کے ساتھ مل کر زیادہ مدت تک کام نہ کر سکتا تھا۔ شفیع اقبال لیگ کی طرف سے جو یادداشت سائمن کمیشن کو بھیجی گئی، اس کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے سر محمد شفیع کے مکان پر جو اجلاس مئی ۲۸ء میں ہوا۔ اس میں علامہ نے بعض اہم امور کے متعلق جن میں صوبائی خود مختاری کا مسئلہ بھی شامل تھا، اپنا اختلاف ظاہر کر دیا۔ یہ مسودہ عارضی سا تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ لیگ کے دوسرے معزز ممبروں کی رائیں بھی حاصل کر لی جائیں۔ جب کچھ عرصے میں آراء موصول ہو گئیں تو ان کے پیش نظر ایک آخری مسودہ تیار کر لیا گیا۔ اسی دوران میں علامہ اقبال کو درد گردہ نے آن دبوچا، یہ علامہ کی پرانی بیماری تھی۔

درد گردہ کا دورہ

اس سے قبل ایک دفعہ ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مرض میں مبتلا ہوتے تھے، اب کے تکلیف کسی قدر زیادہ ہوئی۔ لالہ لاجپت رائے علامہ سے ملنے آئے تو ان کو مشورہ دیا کہ آپ حکیم

نابینا صاحب دہلوی (حکیم عبدالوہاب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری) سے علاج کرائیے؛ چنانچہ وہ دہلی تشریف لے گئے اور لیگ کی یادداشت کے آخری مسودہ کی ترتیب میں شریک نہ ہو سکے۔ جب دہلی سے واپس آئے تو اخباروں میں اس یادداشت کا ملخص شائع ہوا جس کے مطالعے کے بعد علامہ بہت بیزار ہوئے؛ چنانچہ انھوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں مندرجہ بالا واقعات درج کرنے کے بعد لکھا:۔

لیگ کی یادداشت

لیگ نے مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ایک وحدتی صوبائی نظام کی تجویز پیش کر دی ہے جس کے رو سے قانون، امن اور عدل کے محکمے براہِ راست گورنر کو سونپ دیئے جائیں گے یعنی مجوزہ نظام در پردہ دوعملی (ڈایارکی) پر مبنی ہوگا جو کسی اعتبار سے آئینی ترقی کا مترادف نہ ہوگا۔

چونکہ میں ابھی تک اس رائے پر قائم ہوں جو میں نے مسودہ مرتب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں پیش کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ کرنا چاہیئے (اور میرے خیال میں تمام مسلمانانِ پنجاب کی یہی رائے ہے)، مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری نہ رہنا چاہیئے، از راہِ کرم میرا استعفا منظور فرمایا جائے![1]

اس استعفا سے سر محمد شفیع بحد پریشان ہوئے، انھوں نے فی الفور مسلم لیگ،

۱۔ حرفِ اقبال، خطبات و تقاریر، صفحہ ۱۷۹۔

کی یادداشت میں ترمیم کی اور صوبائی خود اختیاری کے مطالبے کو اس میں شامل کرنا پڑا، چنانچہ اس کے بعد علامہ نے بھی یادداشت پر دستخط کر دیئے۔ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کا ایک وفد جس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دینے کے لئے پیش ہوا، سر محمد شفیع اس وفد کے رئیس تھے لیکن سوالات کا جواب دینے میں علامہ بھی شریک تھے، چنانچہ سائمن کمیشن نے بہت سے معاملات میں وفد کے نقطۂ نگاہ کی تائید کی۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ ہندوستانی سیاسیات کا سب سے بڑا مبحث رہی کانگرس اور ہندو سبھا اس کے کلیتہً حامی تھے لیکن مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے تھے: ایک گروہ اس رپورٹ کا حامی تھا، دوسرا جس کے قائد مسٹر جناح تھے، اسمیں کچھ ترمیمات کرانے کا خواہشمند تھا اور تیسرا گروہ کلیتہً اس کا مخالف تھا کیوں کہ اس میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم نہ کی گئی تھی اور ان کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا تھا، اس گروہ کے لیڈر سر محمد شفیع اور علامہ اقبال تھے۔ مسٹر جناح کی طرف سے نہرو رپورٹ میں معمولی سی ترمیمات کے لئے جو کوششیں کی گئیں وہ سب ناکام رہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال اور بعض دوسرے بزرگوں کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مجلس مرکزیہ خلافت کی طرف سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دوسرے اکابر خلافت، جمعیتہ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور دوسرے جلیل القدر علماء، مسلم لیگ کی طرف سے علامہ اقبال، سر ابراہیم رحمت اللہ، سر محمد شفیع

سر عبدالقادر اور دوسرے اکابر اور ہندوستان بھر کے کونسلوں اور اسمبلیوں کے منتخب شدہ ممبر شریک ہوئے۔ سر آغا خاں اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام سیاسی مطالبات کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جس کا چرچا ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہوا اور بعد میں مسٹر محمد علی جناح نے بھی اپنے چودہ نکات اسی قرارداد کے اصول پر مرتب کیے اور دونوں مسلم لیگیں دوبارہ ایک ہو گئیں۔ سیاسیاتِ ہند کی اس طویل بحث میں ہم نے اس مسئلے کو مؤخر کر دیا ہے کہ علامہ اقبال نے پنجاب کی قانون ساز مجلس میں کیا کیا کام کیا۔ اگرچہ علامہ اقبال کا یقین تھا کہ ان کونسلوں میں کوئی مؤثر قومی خدمت انجام دینا بعید دشوار ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار پوری قوت اور سرگرمی سے کیا۔

علامہ اقبالؒ اور سپیکر شپ

پنجاب کونسل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اپنی اکثریت کی وجہ سے برسرِ اقتدار تھی، سر فضل حسین کے صاحبزادے میاں عظیم حسین نے اپنے والد محترم کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ :

> سر فضل حسین نے یہ تجویز کی کہ کونسل کے سپیکر (صدر) چودھری شہاب الدین کی میعادِ صدارت ختم ہونیکے بعد یونینسٹ پارٹی علامہ اقبال کو صدر منتخب کر لے لیکن چونکہ علامہ نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید کر کے اور اخباروں میں اس کے خلاف لکھ کر اس کی ہمدردی کھو دی تھی اس لیے یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نے

ان کو کونسل کا صدر منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔

مالیہ اراضی پر علامہ کے خیالات

۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو علامہ اقبال نے مالیہ اراضی کے مسئلے پر کونسل میں ایک تقریر کی جس میں آپنے فرمایا کہ مالیہ وصول کرنیکا موجودہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے، حکومت مالیہ وصول کرنا اس بنا پر اپنا حق سمجھتی ہے کہ وہ زمین کی مالک ہو حالانکہ یہ نظریہ بالکل فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے بعض یورپی مصنفین کے نظریات کے حوالے دیئے اور ثابت کیا کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی مملکت نے زمین پر اپنے مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کیا۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا لیکن محصول کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے فرمایا کہ انکم ٹیکس محصول ادا کرنے والے کی استطاعت کے مطابق کم اور زیادہ وصول کیا جاتا ہے اور جن لوگوں کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہو، ان سے ٹیکس لیا ہی نہیں جاتا لیکن مالیہ کی یہ کیفیت ہے کہ

> اگر کوئی شخص زمیندار ہو تو خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اس کو لازماً مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زمین کے سوا کسی اور ذریعے سے دو ہزار روپے سالانہ سے کم آمدنی حاصل کرے تو آپ اس پر ٹیکس عائد نہیں کرتے۔

علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھہ سے زیادہ زمین نہ ہو اور جسمیں آبپاشی نہ ہو سکتی ہو اور جس کی پیداوار معین مقدار میں ہوتی ہو، اس

سے کوئی مالیہ نہ لیا جائے۔

حکومت پنجاب نے منٹگمری کی نیلی بار میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ اراضی زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کیا تھا، علامہ نے تحریک پیش کی کہ اس اراضی کا نصف حصہ مزارعین کیلئے مخصوص کیا جائے۔

مذہبی توہین کیخلاف قانون

پنجاب میں مذہبی پیشواؤں کیخلاف توہین آمیز لٹریچر شائع کرنیوالی ایک جماعت ہمیشہ قوموں کے درمیان تکدر اور کشمکش پیدا کرتی رہتی تھی، علامہ نے تجویز پیش کی کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ ان ذلیل حملوں کے انسداد کے لیے ایک قانون نافذ کیا جائے؛ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں یہ قانون نافذ ہو گیا۔

۱۹ جولائی ۲۷ء کے اجلاس میں سردار اجل سنگھ نے تجویز پیش کی کہ آئندہ سرکاری ملازمت کے عہدوں پر کھلے مقابلے کے بعد تقررات ہوا کریں، علامہ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا "کھلا مقابلہ بعض بے انصافیوں کا موجب ہو گا کیونکہ قومیت پرستی کے صرف دعوے ہی دعوے ہیں، حقیقت میں فرقہ پرستی زوروں پر ہے، اس لئے مقابلہ، نامزدگی اور انتخاب کا ملا جلا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ تمام فرقوں کو سرکاری ملازمت کا یکساں موقع مل سکے۔

دوسری تجویزیں اور تقریریں

۱۹۲۷-۱۹۲۸ء کے بجٹ پر علامہ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے دو تجویزیں پیش کیں: ایک یہ تھی کہ دیہات میں صفائی اور حفظانِ صحت کا بہتر انتظام کیا جائے اور ایک رقم خاص عورتوں کی طبی امداد کے لیے مخصوص کی جائے؛

دوسری تجویز یہ تھی کہ جس حالت میں حکومت ہند نے ۸۶ لاکھ روپے کی رقم صوبے کو دینے کا وعدہ کیا ہے حکومت پنجاب کو چاہیئے کہ مالیے میں تخفیف کرے اور اسے انکم ٹیکس کی طرح تدریجی قابلیت ادائی کے مطابق عائد کرے۔

اس کے علاوہ آپ نے لازمی ابتدائی تعلیم پر بیحد زور دیا اور فرمایا کہ صرف چند مدرسوں میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دینے سے مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ پورے صوبے میں یہ قاعدہ نافذ کرنا چاہیئے اور اس پر سختی سے عمل کرانا چاہیئے۔

۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو علامہ نے بجٹ پر سیر حاصل تبصرہ کیا، چونکہ بجٹ خسارے کا تھا اس لیئے حکومت ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے قرض لینے کی خواہاں تھی۔ علامہ نے اس کی مخالفت کی اور صوبے کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی بعض عملی تجاویز پیش کیں، مثلاً مرکزی حکومت سے کہا جائے کہ وہ انکم ٹیکس کو صوبائی محاصل میں شامل قرار دے، محصول فوتی (ڈیتھ ڈیوٹی) ان لوگوں سے وصول کیا جائے جن کو بیس تیس ہزار کی جائداد ترکہ میں ملی ہو، بڑے سرکاری افسروں کی تنخواہیں کم کی جائیں اور مشینری سستی منڈیوں سے خریدی جائیں۔

۷ مارچ ۳۰ء کو بھی علامہ نے بجٹ سیشن میں ایک جامع اور دلچسپ تقریر کی، جس میں آمدنی بڑھانے اور مصارف کو کم کرنے کی تجاویز پیش کیں۔ صنعتی ترقی پر بیحد زور دیا، تعلیم کے سلسلے میں جو مصارف کیئے گئے، ان پر نکتہ چینی کی، اور اس سلسلے میں نہایت معلومات افزا خیالات ظاہر کیئے۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال ؒ نے تعلیم کی عام اشاعت، شراب کے انسداد، غریب طبقے کی فلاح و بہبود، شمشیر کی آزادی، یونانی اور آیورویدک طریق علاج کی

ہمت افزائی اور تعمیرِ قوم کے دوسرے شعبوں کے متعلق نہایت سلجھے ہوئے انداز سے اپنے خیالات کو پیش کیا۔ اگرچہ حکومت ان کے بعض مشوروں پر عمل کرنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہ پاتی تھی لیکن تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اور غریبوں میں بھی علامہ اقبالؒ کی ان تقریروں کا بہت چرچا ہوتا تھا (ملاحظہ ہو خطبات و تقاریر "حرفِ اقبال" اور "اقبال کا سیاسی کارنامہ")

تعزیری چوکی اٹھوائی

نومبر ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے، رنگ محل (لاہور) میں ایک ہندو مسمی نانک چند قتل ہو گیا، حکومت نے اس علاقے میں تعزیری چوکی بٹھا دی جس کا خرچ اہلِ محلہ پر ڈال دیا، علامہ نے حکومتِ پنجاب کو اس کے متعلق ایک سوال بھیجا تاکہ کونسل میں اس کا جواب دیا جائے، اس کے علاوہ انھوں نے بعض حکام سے ملاقات بھی کی۔ ۹ر نومبر کی شام کو لاہور کے کپتان پولیس نے علامہ کو اطلاع دی کہ آپ کے ارشاد کے مطابق حکومت نے رنگ محل سے تعزیری چوکی اٹھا لی ہے، اس پر علامہ نے کونسل کے سیکریٹری کو لکھ کر اپنا سوال منسوخ کرا دیا!

کتاب امداد باہمی

مارچ ہی کا ذکر ہے کہ پنجاب کونسل میں محکمۂ امداد باہمی کی رقم زیرِ بحث تھی کہ اتنے میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے اس بنا پر کاٹ تجویز کی کہ حکومت کے شعبہ اطلاعات نے "امدادِ باہمی" پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کے بعض مضامین پر ازالہ حیثیت عرفی اور دفعہ ۱۵۳ کے ماتحت مقدمہ چلایا جا سکتا ہے، حکومت کو اپنی سرپرستی میں ایسی کتاب

لہ "پیسہ اخبار" ۱۰ نومبر ۲۷ء

شائع نہ کرنی چاہیے تھی۔

اس پر علامہ اقبالؒ اٹھے، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی بے خبری کا بہیدہ مضحکہ اڑایا اور کونسل کو بتایا کہ کتاب "امدادِ باہمی" شعبۂ اطلاعات پنجاب نے شائع نہیں کی بلکہ ایک پرائیویٹ کارخانہ دار مولوی ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت پنجاب نے شائع کی ہے اور عبدالمجید سالک ایڈیٹر زمیندار اس کے مصنف ہیں۔

اس وقت "زمیندار" سے سالک کا تعلق منقطع ہو چکا تھا لیکن جب علامہ اقبالؒ نے ان کو کونسل کی اس بحث کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے اخبار میں لکھا کہ اس کتاب میں ساہوکاروں کے ظلم اور کاشتکاروں کی مظلومی کے متعلق وہی باتیں لکھی ہیں جو مسٹر کیلورٹ، مسٹر ڈارلنگ اور مسٹر تھاربرن اس سے پیشتر واشگاف طور پر لکھ چکے ہیں، اگر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے تو میں بھی حاضر ہوں!

مدراس میں علامہ کے لیکچر

دسمبر ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے، علامہ اقبال مدراس کے علمی حلقوں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور آپ نے اعلیٰ درجے کے فلسفیوں اور عالی پایہ اہلِ علم کے مجمع میں اپنے وہ چھ لیکچر بزبانِ انگریزی ارشاد فرمائے جو وہ دو تین سال سے لکھ رہے تھے! علامہ دسمبر کے آخری ایام میں مدراس پہنچے اور تین دن وہاں قیام رہا۔ مدراس کی انجمن ترقی اردو، ہندو پرچارنی سبھا اور دیگر ادبی و اسلامی اداروں نے سپاس نامے پیش کیے۔ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو آپ بنگلور پہنچے تو ہزاروں لوگوں نے آپ کا

۱۔ ایلیہ اخبار، ۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء ۲۔ یہ چھ لیکچر Reconstruction of Religious thought in Islam کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔

پرجوش استقبال کیا۔ مسلم لائبریری کی طرف سے زیرِ صدارت سر مرزا اسماعیل وزیر اعظم ریاست میسور ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں علامہ کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور جلسہ ڈاکٹر سبرامین وزیرِ تعلیم میسور کی صدارت میں ہوا، اس اجتماع میں بھی بنگلور کے تمام معززین اور اکابرِ علم موجود تھے۔

میسور مہاراجہ صاحب میسور کی طرف سے علامہ کو دعوت موصول ہو چکی تھی، چنانچہ آپ ۱۰ جنوری ۲۹ء کو میسور تشریف لے گئے۔ میسور یونیورسٹی نے علامہ سے ایک بڑے علمی مجمع میں لیکچر کرایا، پھر مسلمانانِ میسور کی طرف سے ٹاؤن ہال میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں نے بھی حضرت علامہ کی پذیرائی میں انتہائی خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں مگر وہ کسی مذہب اور جماعت کی ملک نہیں ہو سکتے، وہ ہم سب کے ہیں؛ اگر مسلمانوں کو ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہمیں بھی فخر ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے!

سلطان ٹیپو حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے عاشق تھے اور متعدد بار ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ چکے تھے۔ اب سفرِ دکن میں موقع آیا تو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر بھی پہنچے۔ سلطان شہید کے مزار پر ایک میسوری شاعر نے ایک نظم سنائی جس سے علامہ بیحد متاثر ہوئے اور اول سے آخر تک آبدیدہ رہے۔ علامہ فرماتے ہیں: میسور میں جہاں کہیں بھی گیا لوگوں کی زبان پر ایک ہی نام تھا یعنی سلطان شہید کا نام۔ جہاں دو تین آدمیوں کی محفل گرم ہوتی، ایک ہی قصہ تھا، ایک ہی رنگین داستان تھی جسے ہر کوئی بیان کرتا اور سب لوگ ادب سے

۱۔ سیرتِ اقبال طاہر فاروقی، ۳۷۔

ہر جھکائے سنتے اور وہ سلطان کی معرکہ آرا زندگی کا ماجرا تھا؛ بازاروں میں دکانداروں کا موضوع سخن بھی یہی تھا۔ دو تین مجلسوں میں جہاں جانے کا مجھے اتفاق ہوا، یہی باتیں ہوتی رہیں؛ میں نے عمداً کئی مرتبہ گفتگو کا رخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا لیکن ہر بار پھر سلطان ٹیپو کا تذکرہ آجاتا!

حیدرآباد دکن میں

میسور سے حضرت علامہ ۱۴ جنوری کو حیدرآباد دکن پہنچے، سٹیشن ہی پر ان کو بتایا گیا کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص مہمان ہیں۔ پلیٹ فارم پر صدہا اشخاص جمع تھے معززین حیدرآباد، یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلبا اور دوسرے اہل ذوق اور مزاح۔ بچے قطار باندھے اقبال کا قومی ترانہ گا رہے تھے۔ علامہ مہمان خانہ شاہی میں تشریف لے گئے اور ۱۸ جنوری ۲۹ء کو گیارہ بجے قبل دوپہر اعلیٰ حضرت کی حضور میں باریاب ہوئے۔

لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت

۱۹۳۰ء تک دونوں مسلم لیگیں ایک ہو چکی تھیں؛ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد مطالبات اور مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات دونوں ایک ہی مطالب رکھتے تھے لیکن چونکہ مسلمانوں کی سیاسیات میں قائدین کے اس گروہ کی برتری ثابت ہو چکی تھی جو روز اول ہی سے جداگانہ انتخاب کا حامی تھا اور علاوہ بریں علامہ اقبال کئی سال سے مسلم سیاست کی نہایت مؤثر خدمت انجام دے رہے تھے، اس لئے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے۔

۱۔ ملفوظات اقبال (عبدالرشید طارق)

نومبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد منعقد ہونے والا تھا۔ اس موقع پر حضرت علامہؒ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ خیالات کی وسعت، لہجے کی صداقت، زبان کی دلفریبی اور مطالبہ سیاسی کی فراوانی کے اعتبار سے بے نظیر و شاہکار تھی۔ پھر حسنِ اتفاق سے یہ وہی تقریر تھی جس میں علامہ اقبالؒ نے تجویزِ پاکستان کی بنیاد رکھ دی اور فرمایا:

مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی نہایت شدومد سے تائید کریگا جو اس قرارداد میں موجود ہیں (آل پارٹیز کانفرنس کی قرارداد)۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑیگی!

یہی وہ پیرِ مشرق کا خواب تھا جس کی تعبیر بعد میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوگیا۔

علامہؒ نے جس دن سے خارزارِ سیاست میں قدم رکھا، اپنے نصب العین کے معاملے میں ذرہ بھر مفاہمت گوارا نہیں کی۔ وہ اوّل و آخر ظاہر و باطن مسلمان تھے اور مسلمانوں کی جداگانہ ملی حیثیت کے سوا اور کسی لائن پر سوچنے کے عادی نہ تھے۔

مفصل خطبۂ صدارت کے لئے ملاحظہ ہو خطبات و تقاریر حرف اقبال۔

نہ تھے، چنانچہ ۱۹۲۶ء سے سے کہ جب وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تادمِ آخر مسلمانوں کے ملی مطالبات اور جداگانہ انتخاب کے حامی رہے، ایک دفعہ سر محمد شفیع جیسے بزرگ بھی اس معاملہ میں تھوڑی دیر کے لئے متزلزل ہوگئے تھے! لیکن اس راستے پر اقبالؒ کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی، سائمن کمیشن سے تعاون کیا، آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کیا، دونوں لیگوں کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے کوشش کی؛ ان تمام اقدامات کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنی متحدہ اور جداگانہ ملی ہستی کو محفوظ کرنے کے لیے یک سو اور متحد ہو جائیں اور قومیت متحدہ کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہونے پائیں، پھر آخر میں ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ میں مسلمانوں کو ایک نصب العین بھی دیدیا، جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہے۔

✢

۱۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۱۵

چوتھی فصل

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک

اب شاعر اقبالؒ اور فلسفی اقبالؒ زیادہ تر استراحت میں مصروف تھا اور علامہ کی پوری زندگی سیاسیات کے لیے وقف ہو رہی تھی اس لئے کہ ہندوستان کی سیاست ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جس پر اگر مسلمان اپنے نصب العین اور لائحۂ عمل کو نہایت وضاحت سے متعین نہ کر لیتے تو ان کا مستقبل نہایت اندیشہ ناک ہو جاتا۔ علامہ اقبالؒ روزِ اوّل ہی سے قومیت متحدہ ہند کے مخالف اور ملّتِ اسلامی کے انقطاع و استقلال کے سرگرم حامی تھے اور ان کی مساعی اب برگ و بار لا رہی تھیں اس لئے انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ اپنے تمام تر اوقات ایسی تحریکات میں صرف کریں گے جن سے مسلمانوں کو ہندوستان میں آزاد اور آبرومند زندگی بسر کرنیکا موقع مل سکے۔

ملک کی سیاسی فضا

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد میں علامہ اقبالؒ نے آزاد مسلم مملکت کی جو تجویز پیش کی وہ کانگرس کی نیشنلزم اور ہندوؤں کی فرقہ پرستانہ منصوبہ بندی کے لئے ایک خوفناک بم کا گولہ ثابت ہوئی؛ چنانچہ جہاں مسلمانوں نے اس تجویز کو

اپنا نصب العین اور علامہ اقبال ؒ کو اپنا رہنما تسلیم کیا، وہاں ہندوستانی پریس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نالہ و فریاد سے قیامت برپا کر دی اور محض اپنی تسلی کی خاطر علامہ ؒ کی تجویز کو خیالی، موہوم، غیر عملی ظاہر کرنا شروع کیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور (دسمبر ۲۹ء) میں آزادی کامل کی قرار داد منظور کر دی تھی اور نہرو رپورٹ کو موقوف و منسوخ قرار دیا تھا۔ اس کے بعد ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا اور مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک سازی کی سول نافرمانی ڈانڈی کے مقام سے شروع کر دی چونکہ کانگرس نے حقوق کے معاملے میں مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا تھا اس لئے مسلمان من حیث القوم اس سول نافرمانی سے الگ رہے، دوسری طرف مسلمانوں نے الہ آباد مسلم لیگ کانفرنس میں آزاد مسلم مملکت کا نصب العین پیش کر دیا تھا اور تیسری طرف حکومت برطانیہ اپنے من مانے آدمیوں کو بٹھا کر لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کر رہی تھی۔

کانگرس اور حکومت

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ حکومت برطانیہ اب ہندوستان کی آئندہ دستور کی بحث میں کانگرس کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہتی تھی اور سول نافرمانی کا زور شور بھی ختم ہو چکا تھا لہٰذا جنوری ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی رہا کر دیئے گئے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدہ ہوا، کانگرس نے سول نافرمانی سے دست برداری کا اعلان کر دیا، سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے اور دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت قریب قریب یقینی ہو گئی۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی گئی، گاندھی جی نے کہا کہ اگر قومیت

پسند مسلمان مسلم مطالبات سے اتفاق کرلیں تو ہم بھی انھیں تسلیم کریں گے۔ چنانچہ شملہ میں جون ۱۹۳۱ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم نیشلسٹ کانفرنس کے نمائندوں کی ایک مشترک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن دفعتاً گاندھی جی نے ایک اور شرط لگائی کہ مسلمان آپس میں اتفاق کر کے سکھوں کو بھی رضامند کریں۔ اس پر فضا بالکل بگڑ گئی اور صاف نظر آ گیا کہ کانگرسی رہنما مسلمانوں کے متحد ہو جانے پر بھی مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

چونکہ اب حکومتِ برطانیہ اور کانگرسی رہنماؤں میں گاڑھی چھننے لگی تھی اور معاہدے کے بعد صلح صفائی ہو چکی تھی اس لئے مسلم لیگ اور اقلیتوں کی دوسری جماعتیں خائف ہو رہی تھیں کہ حکومتِ برطانیہ کانگرس کو خوش کرنے کے لئے اقلیتوں کو قربان کر دے گی اور ان کے حقوق نظر انداز ہو جائیں گے۔ اس موقع پر علامہ اقبالؒ نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک کھلا مکتوب شائع کیا جس میں نہایت شائستہ اور مدلل انداز میں انگریزوں کو ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جو ہندوستان کے متعلق ان پر عائد ہوتی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ:

ہم وہی حربہ استعمال کریں گے

آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہوگی۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیشِ نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور انھیں برسرِ اقتدار رکھے تو ہندوستان کے

مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ سواراج یا اینگلو ہندو سواراج کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں گے جو گاندھی جی نے برطانیہ حکومت کے خلاف کیا تھا۔ مزید برآں اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کی آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوق و اقتدار کو سخت صدمہ پہنچے۔

اس زمانے میں انگریز عام طور پر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے کہ مسلمان روس کی طرف مائل نہیں ہو سکتے کیونکہ کمیونزم مذہب اسلام کے خلاف ہے۔ علامہ نے ان کے اس خیال کو بھی کمزور کرنے کی کوشش کی۔

کمیونزم اسلام اور روس

میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی عوام فطرۃً لامذہب نہیں ہیں بلکہ میری رائے میں وہاں کے مردوں اور عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ روس کی مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معین عرصہ تک نہ رہے گی، کیونکہ کسی معاشرے کا نظام زیادہ دیر تک دہریت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جوں ہی حالات معمول پر آئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملا، وہ یقیناً اپنے نظام کیلئے کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ اگر بولشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بولشوزم اسلام کے بہت قریب آجاتا ہے اس لئے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہو گا کہ نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت کیا ہو گی۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی اور علامہ اقبالؒ اس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے تمام ممبر حکومت کے نامزد کردہ تھے جو اس نے خود ہی کانگرس، لیگ اور دوسری جماعتوں میں سے چن لیے تھے گاندھی جی نے انتہائی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مشہور کانگرسی مسلمان لیڈر ڈاکٹر انصاری بھی گول میز کانفرنس کے ممبر نامزد ہو جائیں۔ لیکن حکومتِ برطانیہ نے گاندھی جی کی یہ استدعا تسلیم نہ کی۔ علامہ اقبالؒ کی نامزدگی لازمی تھی اس لیے کہ اس زمانے میں مسلم حقوق و مطالبات کے متعلق کوشش کرنے والے اور ہندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کی مستقل انفرادیت کی حفاظت کرنے والے لیڈروں میں علامہ اقبالؒ سب سے زیادہ ممتاز تھے اور ملتِ اسلامی کی عظیم اکثریت ان کی ہم خیال و ہم آہنگ ہو چکی تھی۔

مہر صاحب کی معیت

علامہ اقبالؒ دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا غلام رسول مہر (مدیر انقلاب) ساتھ ہو لیے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ اوّل علامہؒ کے لیے ایک مخلص رفیقِ سفر اور ہم خیال دوست کی ہم راہی موجب آسائش ہو گی؛ دوم مہر صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے پرائیویٹ طور پر علامہ اقبالؒ اور دوسرے ارکانِ کانفرنس کے لیے موجبِ تقویت رہیں گے؛ سوم وہ روزنامہ "انقلاب" کے لیے گول میز کانفرنس کی روداد قلم بند کر کے بھیجا کریں گے۔

گول میز کانفرنس کی دو کمیٹیاں تھیں: ایک اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی؛ دوسری

وفاقی نظام پر غور کرنے والی کمیٹی، علامہؒ اوّل الذکر کمیٹی کے ممبر تھے۔

سر آغا خاں گول میز کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں کا نظام کار یہ تھا کہ ان میں ممبر تو سب کے سب شریک ہوتے تھے لیکن گفتگو کا فرض رئیسِ وفد ہی کو ادا کرنا ہوتا تھا وفد کے ممبر اپنے رئیس کو مختلف امور کے متعلق مشورہ دیتے رہتے تھے مسلم وفد کے سر گروہ سر آغا خاں تھے، علامہ اقبالؒ عام طور پر سر آغا خاں کو مسائل کے متعلق مشورہ دیتے رہے اور آغا خاں کانفرنس اور کمیٹیوں میں وفد کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے۔

گاندھی جی کی شرائط اقلیتوں کی کمیٹی کے دو ابتدائی اجلاس تو محض رسمی تھے جن میں قرار دیا گیا کہ کمیٹی کے ممبر غیر رسمی طور پر بات چیت کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ گاندھی جی نے ان دنوں کہا کہ میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات کو قبول کرتا ہوں لیکن یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ کانگرس بھی ان کو قبول کرے گی۔ علامہؒ نے کہا کہ آپ کانگرس کی مجلسِ عامہ کو تار دے کر اس کی رضامندی حاصل کر لیں لیکن گاندھی جی اس پر راضی نہ ہوئے اور اعلان کیا کہ میں مسلم مطالبات کو تسلیم کرتا ہوں بشرطیکہ مسلمان بالغوں کے حق رائے دہی کو مان لیں، کامل آزادی کے نصب العین کی تائید کریں اور اچھوتوں کے حق انتخاب جداگانہ کی تائید نہ کریں۔

علامہ اقبالؒ کو پہلی دو شرطوں کے قبول سے انکار نہ تھا لیکن وہ تیسری شرط ہرگز تسلیم نہ کر سکتے تھے۔ جب وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق طلب کرتے تھے تو دوسری اقلیتوں کو کس منہ سے محروم قرار دیتے۔ ۱۵ر اکتوبر کو پرائیویٹ

گفت وشنید شروع ہوئی، کئی سکیمیں پیش ہوئیں؛ آخر ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق قرار پا گیا جس میں سکھ شامل نہ تھے۔ ۱۳ نومبر کو اقلیت کمیٹی کا چوتھا اور آخری اجلاس ہوا جس میں اقلیتوں کا میثاق وزیر اعظم برطانیہ کے سپرد کر دیا گیا۔

رفیقوں کی علحدگی

گول میز کانفرنس کی دوسری کمیٹی وفاق ہند کی نوعیت پر غور کرنے کے لیے قائم تھی، علامہ اقبال رح نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء ہی میں آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف اظہارِ خیال کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ پہلے صوبائی خود اختیاری حکومت قائم کی جائے اور جب ان حکومتوں کا تجربہ کامیاب ہو جائے تو مرکز میں وفاق کیا جائے اور اولین مرحلے پر یہ وفاق بھی صرف برطانوی ہند کے صوبوں کا ہو، ریاستیں شامل نہ کی جائیں؛ چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء کو وفاق ہند والی کمیٹی کے مسلم ارکان نے یہ طے کیا کہ وہ اس کمیٹی کی کسی کارروائی میں حصہ نہ لیں گے۔ علامہ اسی دن سے اس کمیٹی کے ارکان سے علحدہ ہو گئے تھے لیکن ۲۶ نومبر کو دفعتاً اس کمیٹی کے ارکان نے اپنے سابقہ فیصلے کو پس پشت ڈال کر وفاقی کمیٹی میں حصہ لیا اور ان کے سرگروہ نے یہ کہا کہ صوبائی خود اختیاری کے ساتھ مرکز میں وفاق قائم کر دیا جائے۔ علامہ رح کو ان ممبروں کے ناگہانی اور پر اسرار فیصلے پر رنج ہوا اور وہ مسلم وفد سے علحدہ ہو گئے۔ یہاں مشہور ہو گیا کہ علامہ رح نے وفد سے استعفا دیدیا ہے لیکن واپسی پر لاہور میں علامہ رح نے بتایا کہ میں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا بلکہ مسلم وفد سے علحدگی اختیار کی ہے اور میرا یہ عمل آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ہے۔[۱]

۱۔ روزنامہ "انقلاب" ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

موتمر عالم اسلامی

دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوگئی، علامہؒ مع غلام رسول مہر انگلستان سے روانہ ہوکر فلسطین پہنچے جہاں علامہؒ موتمر عالم اسلامی میں مسلمانانِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے۔ واپسی پر لاہور میں آپ نے فرمایا کہ "سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ وہاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش مصر، یمن، شام، عراق، فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی! شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا، ان نوجوانوں میں اُس خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی جو میں نے اطالیہ کے فاشسٹ نوجوانوں کے سوا کسی میں نہیں دیکھی!

موتمر اسلامی کے متعلق علامہؒ نے فرمایا کہ مقامی جماعتی اختلافات کے باوجود موتمر شاندار طریق پر کامیاب ہوئی، اس اجتماع میں اکثر اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کی آزادی کی مسائل پر مندوبین نے بیحد جوش و خروش کا اظہار کیا۔ عرب پیدائشی مقرر اور خطیب ہیں اور غالباً یہ ان کی زبان کی خصوصیت ہے کہ وہ ایسے واقع ہوئے ہیں۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھیں لیکن افسوس ہے کہ میں ان سب میں شرکت نہ کر سکا۔ میں نے ایک سب کمیٹی میں یروشلم میں قدیم جامعہ ازہر کے طرز پر اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید انداز پر قائم کی جائے۔ رائیٹر کے مبہم سے تار کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ میں

۱. روزنامہ 'انقلاب' ۳ جنوری ۱۹۳۲

یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں، میری خواہش یہ ہے کہ عربی زبان بولنے والے صرف ایک نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علم جدید کو زبانِ عربی میں منتقل کر لیں ٭

واپس لاہور میں

۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حضرت علامہؒ بمعیت مولانا غلام رسول مہر لاہور پہنچ گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر شاندار استقبال ہوا۔ جمعیت اسلام کے ارکان نے علامہؒ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کرنا چاہا جو ہجوم کی کثرت کے باعث پڑھا نہ جا سکا۔ اس میں علامہؒ کی خدمات اسلامی کو سراہا گیا تھا اور ان کی بخیریت مراجعت پر ہدیہ تبریک پیش کیا گیا تھا۔ مذکورہ بالا انٹرویو کے دوران ہی میں علامہؒ نے فرقہ وار تصفیے کے متعلق فرمایا کہ اس سلسلے میں جن مسائل کو طے کیا جا چکا ہے، ان پر دوبارہ بحث نہ کی جائے۔ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور سے بحث و تمحیص ختم ہو چکی ہے اور دارالعلوم میں وزیر اعظم اور سر سموئل ہور نے ان کے متعلق واضح بیان بھی دے دیا ہے۔ اب جس مسئلے کا تصفیہ باقی ہے وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے۔ اب اس کو حل کرنا چاہیے ٭

مسلمانوں کی بدگمانی کے اسباب

دوسری گول میز کانفرنس میں پنڈت مالوی، ڈاکٹر مونجے اور بعض دوسرے ہندو سبھائی لیڈروں نے اقلیتوں کے میثاق سے متاثر ہو کر اور فرقہ وار مسئلے سے عاجز ہو کر مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم

٭ "انقلاب" ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

برطانیہ کو چٹھی لکھدی کہ فرقہ وار مطالبات کا فیصلہ آپ ہی کر دیجیے، ہمیں وہ فیصلہ منظور ہوگا۔ گاندھی جی نے اس چٹھی پر تو دستخط نہیں کیے لیکن ایک علیحدہ خط اسی مضمون کا اپنی طرف سے بھی لکھدیا۔ ہندو لیڈر جانتے تھے کہ رامزے میکڈانلڈ ہمارا پرانا دوست ہے، اسی کی لیبر پارٹی کو ہم وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیتے رہے ہیں اور اس کا جھکاؤ بھی ہمیشہ کانگرس ہی کی طرف رہا ہے اس لئے معاملہ اسی پر چھوڑ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم بھی میکڈانلڈ کے فیصلہ ثالثی کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن مسلمانوں نے صاف انکار کر دیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں جو بیان دیا اس سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہندوؤں کی طرف مائل ہے، اس کے علاوہ کانگرس پھر سول نافرمانی کی لیے پر تول رہی تھی اور مسلمان گوناگوں اندیشوں میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب کانگرس اور ہندو سبھا کے لیڈر اندر ہی اندر انگریزوں سے دوستی اور اعتماد کی پینگیں بھی بڑھا رہے ہیں اور سول نافرمانی کا دباؤ بھی ڈال رہے ہیں تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ فرقہ وار فیصلے میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کر کے اپنے دوستوں کو ناراض کر لیں؛ کانگرسی خیال کے مسلمانوں نے ملت اسلامی کی متحدہ قوت میں رخنہ ڈال کر اسے اور بھی کمزور کر رکھا تھا۔

یہ سیاسی حالات تھے جن میں آل انڈیا مسلم کانفرنس[1] نے فیصلہ کیا کہ اس کا آئندہ اجلاس عام فروری ۱۹۳۲ء زیر صدارت علامہ اقبال منعقد ہوگا۔ حاجی رحیم بخش مرحوم مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۔ دہلی والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس اب آل انڈیا مسلم کانفرنس کہلاتی تھی۔

خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس

اس کانفرنس میں علامہ اقبالؒ نے جو خطبۂ ارشاد فرمایا وہ اپنی عملیت، اپنے مطالب کی ہمہ گیری اور جذبہ انگیزی کے اعتبار سے الہ آباد والے خطبہ سے بھی بہتر تھا۔ اس میں علامہؒ نے گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کی کارگزاری سنائی اور گاندھی جی، مالوی جی، ہندوؤں اور سکھوں کے رویے کی تفصیلات پیش کیں، اپنے ان رہنماؤں کی بھی شکایت کی جو صوبائی خود اختیاری کے ساتھ ہی وفاق کا مطالبہ بھی کرنے لگے حالانکہ اس سے قبل فیصلہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ پھر علامہ رح نے مسلمانوں کے غیر منظور شدہ مطالبات کا ذکر کیا اور کانگرس کی آئندہ سول نافرمانی کا مقصد یہ بتایا کہ کسی طرح حکومتِ برطانیہ کو کانگرس کی حسب منشا فرقہ وار فیصلہ صادر کرنے پر مجبور کیا جائے۔ آپ نے صوبہ سرحد، عبد الغفار خاں، مسئلہ کشمیر، ہندو مسلم فسادات، اقلیتوں کے اندیشوں اور دیگر مسائل کے متعلق نہایت عمیق خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا:

یہ مناظر محض ایک آنے والے طوفان کے آثار ہیں جو سارے ہندوستان اور ایشیا کے باقی حصوں پر بھی چھا جائیگا۔ یہ قطعاً اس سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ہے جس نے انسان کو ایک ایسی چیز تصور کر رکھا ہے جس سے جلب منافع کیا جائے حالانکہ انسان ایک شخصیت ہے جس کو خاص کلچرل طاقتوں سے نشو و نما اور ترقی دینی چاہیے۔ اقوام ایشیا یقیناً اس قابو چیانہ اقتصاد کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوں گی جس کو مغرب نے ترقی دے کر ایشیا کی قوموں پر عائد کر رکھا ہے،

ایشیا اپنی غیر منضبط انفرادی کیفیت کے ساتھ زمانہ حال کی مغربی سرایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دین کا منشا

جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر وقیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں کی خدمت میں صرف کر دے۔ اس دین قیم کے امکانات مضمرابھی ختم نہیں ہوئے، یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں، جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو جسمیں ایک اچھوت ایک شہزادی سے شادی کر سکے جسمیں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو اور جس میں سرمایے کو اس طرح المضاعف ہوتے مرتفع نہ دیا جائے کہ وہ حقیقی دولت آفریں طبقے پر غلبہ پا جائے۔

ملاؤں کے فرسودہ اوہام

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے، روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنیوالے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یک لخت بدل دیا جائے: تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین

کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔ ہندوستانی مسلمان اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کے تجسس کو مدت سے ترک کر چکا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں رنگ و آہنگ اور رونق و درخشانی کا نشان تک نہیں رہا اور ہر وقت اس امر کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ بعض طاقتوں سے جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ کھلی جنگ میں شکست نہیں دے سکتا، بزدلانہ و نامردانہ سمجھوتہ نہ کرے۔

آگے چل کر فرمایا:۔

شعلۂ حیات روشن کرو مسولینی کا اصول یہ تھا کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے، اس کے پاس روٹی ہے لیکن میں اسمیں ترمیم کر کے کہتا ہوں کہ جو شخص خود فولاد ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے۔ سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہ ہی ایک راز ہے۔ ہمارا نصب العین بالکل معین اور واضح ہے، وہ نصب العین یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کیلئے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی جواب وہ قوتوں کو منظم کیا جائے۔ شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا، وہ صرف اپنی روح کی آتش کدہ میں روشن کیا جا سکتا ہے۔

ان ولولہ انگیز فقروں کے بعد علامہؒ نے مسلمان قوم کے لئے تنظیمی تجاویز پیش کیں کہ ایک ہی سیاسی انجمن ہو، ایک ہی قومی سرمایہ ہو جس کے ماتحت یوتھ لیگیں اور رضاکاروں کے جیش منظم کئے جائیں۔ کلچرل ادارے

قائم کیے جائیں، ہارٹوگ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تعلیم کی ترویج کا انتظام کیا جائے اور سب سے بڑی تجویز یہ پیش کی کہ

علما و وکلا کی مجلسیں

ایک جمعیت علما قائم کی جائے جس میں وہ مسلمان قانون داں لازماً شامل ہوں جنھوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ شرع اسلام کی حفاظت کی جائے اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری ہو تو حالاتِ جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر تاویل کی جائے جس میں اس کے اصولِ اساسی کی سپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے۔ اس مجلس علمار کی حیثیت آئینی اعتبار سے مسلم ہونی چاہیے تاکہ ہر مسودۂ قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا سے تعلق رکھتا ہو، مجلس وضع قوانین میں زیرِ بحث آنے سے پیشتر اس جمعیت علما میں پیش ہو کر بحث تمحیص کی تمام مراحل طے کر لے![1]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے اس خطبۂ صدارت سے ہندوستان و انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی کیونکہ یہ خطبہ صاف گوئی، خلوص، خودداری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضروریاتِ وقت کے مطابق سیاسی تدبر کا بھی شہ کار تھا۔ اس میں علامہؒ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید بھی کی اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کا حق بھی ادا کیا، کانگرس کی سول نافرمانی کے خلاف نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کی غیر منصفانہ ضد پر افسوس کیا، ان مسلم مندوبین کو بھی ہدفِ ملامت بنایا جنھوں نے وفاقی نظام کمیٹی میں

۱۔ اقتباسات خطبۂ صدارت از "انقلاب" مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء

شرکت اختیار کر لی تھی۔ علامہ نے نہایت بیباکی سے صاف کہہ دیا کہ حکومت برطانیہ کی حکمت عملی متذبذبانہ ہے، وہ انگریز غلطی پر تھے جنھوں نے مسلم مندوبین کو وفاقی کمیٹی میں شرکت کا مشورہ دیا، وزیر اعظم برطانیہ کی اختتامی تقریر افسوسناک ہے، اور فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہونے میں تاخیر کا الزام حکومت برطانیہ پر ہے۔ علامہ نے مسلمانوں کو جہاں کانگرس کی سول نافرمانی سے الگ رہنے کا مشورہ دیا وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمانوں کو حکومت پر اعتماد کی پالیسی ترک کر کے ایک آزادانہ اور خودمختارانہ حکمت عملی وضع کرنی چاہیے کیونکہ اعتماد کی پالیسی نے انھیں نہ اب تک کوئی فائدہ پہنچایا ہے نہ آئندہ اس کی کوئی توقع ہے۔

علامہ اقبالؒ کے اس خطبے سے حکومت برطانیہ اور وزیر ہند بہت آزردہ ہوئے اور اس امر کی کوئی توقع باقی نہ رہی کہ وہ آئندہ بھی علامہ کو گول میز کانفرنس میں مدعو کریں گے۔

اس کانفرنس میں مسلمانوں کے حقوق و مطالبات، کانفرنس کی شاخوں کی تنظیم اور دیگر مسائل قومی کے متعلق مفید قراردادیں منظور کی گئیں!

مسلمانانِ ہند کو حکومت برطانیہ کی طرف سے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کا شدید انتظار تھا اس لئے کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر فرقہ وار فیصلے کا اعلان ۳۰ جون ۳۲ء سے قبل نہ ہو جائے تو کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۳ جولائی ۳۲ء کو منعقد کیا جائے جس میں راست اقدام کی تدابیر طے کی جائیں۔ چنانچہ مولانا شفیع داؤدی سیکرٹری کانفرنس نے اس اجلاس کے دعوت نامے

۱ مفصل قراردادوں کے لئے ملاحظہ ہو "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ۱۵۶/۱۵۳۔

بھی جاری کر دیئے اور الہ آباد مقام اجلاس قرار پایا لیکن مجلس عاملہ کے بعض ممبروں کے مشورے سے علامہ اقبالؒ نے اس اجلاس کو آخر جولائی تک ملتوی کر دیا۔[۱] اس پر ایک گروہ نے بہت شور مچایا جس کا مقصد یہ تھا کہ راست اقدام کا فیصلہ جلد سے جلد ہو۔ انھوں نے کہا کہ اقبالؒ کا یہ فیصلہ ڈکٹیٹرانہ فعل ہے۔ چنانچہ ۲ جولائی کو الہ آباد ہی میں مسلم کانفرنس کے بعض منقتدر ممبروں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں علامہؒ کے اس اعلانِ التوا کے خلاف احتجاج کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ تجویز کی کہ کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت قائم کی جائے۔ یہ علی الاعلان کہا گیا کہ علامہ نے شملے کے اشارے پر مجلس عاملہ کا اجلاس ملتوی کیا ہے۔

اس پر علامہؒ نے ایک بیان شائع کیا جس میں جلسۂ الہ آباد پر ناراض ہونے کی بجائے مولانا حسرت موہانی کے اقدام کو درست بتایا اور فرمایا کہ مولانا کا طرزِ عمل خود میری تجویز کے مطابق ہے کہ مسلمانوں کا ایک ہی آل انڈیا سیاسی ادارہ ہونا چاہیے جس کے اندر ہر سیاسی عقیدے کو برسرِ اقتدار آنے کا موقع حاصل رہے۔ آپ نے بتایا کہ مجلسِ عاملہ کے ایک اجلاس میں جس میں وہ خود شریک تھے، مولوی شفیع داؤدی کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر ان کے نزدیک فرقہ وار فیصلے کا اعلان ۳ جولائی تک اغلب نہ ہو تو وہ اجلاسِ عاملہ کو ملتوی کر سکتے ہیں لہٰذا اس التوا کو آمرانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

علامہؒ نے فرمایا کہ اگر فرقہ وار فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ہو تو مسلمانوں کا

۱۔ روزنامہ انقلاب ۳ جولائی ۳۲ء

فرض ہے کہ حکومت سے لڑیں لیکن محض اس بات پر میں انھیں لڑنے کا مشورہ نہیں دوں گا کہ حکومتِ برطانیہ اس فیصلے کے اعلان میں تاخیر کر رہی ہے۔" اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کریں گے کہ اجلاس عاملہ کو ملتوی کرنے کا جو مشورہ میں نے دیا تھا، وہ کہاں تک شملے کے اشارۂ چشم و آبرو، سے متاثر تھا:

میں نے اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں کبھی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی۔ ایسے وقت میں جب قوم کے اہم ترین مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے۔ میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ التوا کی خواہش کرنے والوں کے رویّے کی یہ تعبیر ہرگز نہ کرنی چاہیے کہ وہ قرار داد لاہور (یعنی راست اقدام) پر عمل کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہیں گے جب تک اس عمل کی ضرورت لاحق نہ ہو، جماعت کو چاہیے کہ اپنی طاقت کو محفوظ رکھے۔[۱]

عین اس موقع پر مولوی شفیع داؤدی نے سیکرٹری کے عہدہ سے استعفا دیدیا۔[۲] اس پر علامہ اقبالؒ نے سیّد ذاکر علی سیکریٹری یو۔ پی مسلم کانفرنس (لکھنؤ) کو اور مولوی شفیع کو تار دیئے کہ وقت بہت نازک ہے آپس میں بیٹھ کر بات چیت کر لیجئے اور مولوی شفیع استعفا واپس لے لیں۔ غرض اس التوا نے اجلاس کے مسئلے پر علامہ اقبالؒ کو اپنے حامیوں اور مداحوں کی طرف سے بھی مخالفت برداشت

۱۔ سیاسی کارنامہ ۱۵۹ ۲۔ انقلاب ۴ جولائی ۳۲ء

کرنی پڑی لیکن وہ اس بات پر جمے رہے کہ التواہی مناسب ہے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے ایک بیان میں علامہ کی تائید کی، اس الزام کو شرمناک بتایا کہ اس میں شملے کا اشارہ تھا، مولوی شفیع داؤدی کے استعفے کو جلد بازانہ بتایا اور ظاہر کیا کہ مجھے اور علامہ اقبالؒ کو ہندوستان بھر کے گوشے گوشے سے مجالس قانون ساز کے ممبروں کی طرف سے بیشمار تار موصول ہوئے تھے کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔

یہ طوفان بہت جلد تھم گیا اور اس نئی جماعت کے بعض لیڈروں نے خود علامہ اقبالؒ سے ملاقات کر کے عرض کیا کہ موجودہ حالات میں مجلس عاملہ کے اجلاس کا التواہی مناسب تھا اور برطانوی حکومت نے چونکہ ہندوستانی جماعتوں کی درخواست پر فرقہ وار مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری لی ہے اس لئے ہم کو اس کے فیصلے تک انتظار کرنا چاہیئے۔[1] غرض علامہ اقبالؒ کے خلوص اور ان کی شخصیت کے اثر نے کانفرنس کو اختلاف کی نذر نہ ہونے دیا اور آخر میں سبھی ان سے متفق ہو گئے۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق ہو گیا تھا جس میں سکھ شامل نہ ہوئے تھے اب کہ فرقہ وار فیصلے کا اعلان کا وقت قریب آیا، سکھوں نے بھی پر پرزے نکالے اور تیاری شروع کر دی کہ فیصلے کے اعلان کے وقت ایسی ہنگامہ آرائی کی جائے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو صدمہ پہنچے۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے ۲۵ جولائی ۳۲ء کو ایک اعلان شائع کیا جس میں سکھوں کے شائع کردہ بیانات اور منعقد کردہ جلسوں پر اظہار افسوس کیا۔

۱۔ سیاسی کارنامہ ۱۶۰

آپ نے فرمایا کہ ہندو قوم سکھوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کا اثر اقلیتوں پر یہ ہو گا کہ وہ ہندوؤں کے غلبے کو اور بھی زیادہ اندیشے کی نظر سے دیکھیں گے کیونکہ ان کو مرکز اور چھ صوبوں میں اقتدار اکثریت حاصل ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان جس قدر اپنے جماعتی حقوق کو محفوظ کرانے کے لئے مضطرب ہیں، اسی قدر ملک کی دستوری ترقی کے لئے بھی بے چین ہیں! جن تحفظات کا مطالبہ انھوں نے کر رکھا ہے، وہ ایک آل انڈیا اقلیت کی حیثیت سے ان کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں!

اس وقت علامہ اقبالؒ کے ایک پرانے اور مخلص دوست سردار جگندر سنگھ حکومتِ پنجاب میں وزیر زراعت تھے۔ انھوں نے پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کا آغاز کیا۔ اس کا مختصر قصہ علامہ اقبالؒ کی زبانی سنیئے۔ "انقلاب" ۷ اگست ۱۹۳۲ء میں علامہ کے ایک انٹرویو کی کیفیت درج ہے جس میں علامہ بیان کرتے ہیں "سر جگندر نے ایک سکیم کے متعلق گفت و شنید کی دعوت دی ہے۔ سکیم یہ ہے کہ صوبے کی کونسل کے ۱۷۵ ممبروں میں مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت پر مطمئن ہو جانا چاہیئے یعنی کونسل میں ہندو سکھ وغیرہ ۸۷ ہوں اور مسلمان ۸۸۔ میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، پھر سر جگندر نے ایک اور سکیم مجھے ارسال کر دی۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا یہ تمام مکاتیب پرائیویٹ تھی، پھر معلوم نہیں اس کو ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعہ کیوں شائع کر دیا گیا۔ بہر حال میں کسی ایسی سکیم کو قبول کرنے

۱: حرف اقبال" ۱۹۶/ ۱۹۵

پر آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں مسلمانوں کو حقِ اکثریت نہ دیا گیا ہو یعنی مسلمانانِ پنجاب کم سے کم اکیاون فی صدی نشستوں پر رضامند ہو سکتے ہیں، سر جگیندر سنگھ نے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کے لئے تو صرف ایک نشست کی اکثریت تجویز کی تھی لیکن مسلمانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سکھوں کے لئے مرکزی مجلسِ قانون ساز میں پانچ فی صدی صوبہ سرحد میں چھ فی صدی اور مرکزی وزارت میں ایک نشست مخصوص کرنے کی تائید و حمایت کریں، اس کے بعد سکھ اقلیتوں کے معاہدے میں شامل ہو جائیں گے: علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ رہا شملے میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کسی گفت و شنید کا مسئلہ تو اس کے متعلق میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ

> اگرچہ میں ہر معقول نصیفے کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں اور یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ فیصلہ حکومت کے اس اعلان سے پیشتر ہی کر لیا جائے جو ۱۷ اگست کو ہونے والا ہے لیکن میں مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اس قسم کی گفت و شنید میں شریک ہونے کو تیار نہیں ہوں جب تک کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کی طرف سے مجھے اس کا اختیار نہ دیا جائے![1]

اس کے بعد مجلسِ عاملہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس ۷ اگست کو دہلی میں ہوا، علامہؒ نے صدارت فرمائی۔ اس اجلاس میں ایک تو حکومتِ برطانیہ سے فرقہ وار فیصلے کے جلد تر اعلان کا مطالبہ کیا گیا اور دوسرے یہ بھی قرار دیا گیا کہ

۱۔ روزنامہ انقلاب، ۱۲/۷ اگست ۱۹۳۲ء

اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات بھی تسلیم نہ کیے جائیں تو مجلس عاملہ حسب ذیل اشخاص کی ایک کمیٹی مرتب کرتی ہے تاکہ آئندہ کے لیے قومی پروگرام وضع کر کے مجلس عاملہ کو پیش کرے :۔ سر محمد اقبالؒ (صدر)، مولانا مظہر الدین، مولانا حسرت موہانی، سید حبیب، مولانا غلام رسول مہر، حسن ریاض، ذاکر علی (ارکان)

۱۶ اگست کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وار فیصلے کا اعلان کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ سارا سیاسی ہندوستان بحث و نزاع کا ایک ہنگامہ زار بن کر رہ گیا۔ ۲۴ اگست کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں زیر صدارت علامہ منعقد ہوا جس میں فرقہ وار فیصلے کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی : ۲۴ اگست کو حضرت علامہؒ نے قرارداد کی تائید میں ایک اہم بیان صادر فرمایا جس میں فرقہ وار فیصلے پر ذیل کے اعتراضات کیے گئے تھے :

اول پنجاب کی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں دی گئی حالانکہ صوبے میں ان کی آبادی کا تناسب ۵۵ فی صد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ سکھوں کو زائد استحقاق نشستیں (پاسنگ) بہت زیادہ دی گئی ہیں، پھر یہ قید لگا دی گئی ہے کہ وہ بعض نشستوں کو مشترکہ انتخاب کے ذریعے سے حاصل کریں۔

دوم۔ بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود انھیں ۴۸.۴ نشستیں دی گئی ہیں اور مسلمانوں کی حق تلفی کر کے یورپین جماعت کو پاسنگ دیدیا گیا ہے۔

سوم۔ بنگال، پنجاب اور سرحد کی غیر مسلم اقلیتوں کو پاسنگ بہت

زیادہ دیا گیا ہے حالانکہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو اتنا پاسنگ نہیں دیا گیا۔

علامہؒ نے ان نقصانات کی تلافی کے لئے دو تجویزیں پیش کیں: اول۔ چونکہ بنگال بہت بڑا صوبہ ہے اس لئے وہاں مجلس قانون ساز دو ایوانی ہو، کابینہ ان دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس کے آگے جواب دہ ہو اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں؛ اس طرح مسلمانوں کو بنگال میں مستحکم اکثریت حاصل ہو سکے گی۔ دوم صوبوں کو حقیقی اختیارات دیئے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات حاصل ہوں![1]

مسلمانوں کے لیڈروں میں جو لوگ مخلوط انتخاب کے حامی تھے، وہ ایک طرف یہ کوشش کرتے تھے کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کو چھوڑ کر مخلوط انتخاب منظور کر لیں اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہتے تھے کہ تم مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کر کے انھیں مطمئن کر دو تاکہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہو جائے۔ ان لوگوں نے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کے بعد بھی اپنی مساعی کو ترک نہ کیا بلکہ نئے جوش کے ساتھ گفتگوئے مفاہمت میں مصروف ہو گئے۔ مولانا شوکت علی، شیخ عبدالمجید سندھی (صدر خلافت) اور مولانا ابوالکلام کچھ ابتدائی گفتگو پنڈت مدن موہن مالوی سے کر چکے تھے، انھوں نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد کر کے علامہ اقبالؒ کو بھی دعوت دیدی۔ علامہؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس موقع پر ایسی کانفرنس کا انعقاد صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے اسلئے

۱۔ بیان اقبالؒ — روزنامہ انقلاب۔ ۲۶ اگست اور "حرف اقبال" ۲۰۳

کہ اس سے وہ اتحاد خطرے میں پڑ جاتا ہے جو بڑی زحمت کے بعد مسلم جماعت میں پیدا ہوا ہے مخلوطی حضرات یہ کہ رہے تھے کہ فرقہ وار فیصلے میں پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت سے جو ناانصافی کی گئی ہے، اگر ہندو لیڈر اس کی تلافی کر دیں تو مسلمان جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو کر مخلوط انتخاب اختیار کریں۔ علامہ اقبالؒ اس بنا پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور فرماتے تھے کہ جب مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی قرار دادوں میں پوری مسلم قوم جداگانہ انتخاب کے حق میں قطعی فیصلہ صادر کر چکی ہے تو اب اس مسئلے کو از سرِ نو چھیڑنا دانشمندی نہیں ہے!

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں جو کانفرنس منعقد ہوئی، اس کی قرارداد کا منشا یہ تھا کہ اگر ہندو ان تیرہ مطالبات کو منظور کر لیں جو مسلم کانفرنس نے پیش کیے تھے تو مسلمان مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں گے۔ چونکہ یہ موقف بالکل وہی تھا جو ابتدا میں مسلم کانفرنس نے اختیار کیا تھا اس لئے علامہ اقبالؒ نے اس پر ایک بیان دیا کہ اس قرارداد سے ہمارے قوم پرست مسلم بھائی مسلم عوام کے زیادہ قریب آ گئے ہیں، اب انھوں نے اس امر پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ انتخاب کے معاملہ میں مسلم عوام کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیں گے؛ مجھے یقین ہے کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں سے اسی فیصلے کا اظہار ہوتا ہے۔ جس حالت میں ہندوؤں نے تیرہ مطالبات منظور نہیں کیے، انتخاب کے متعلق مسلمانوں کو کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے؟ لیکن قوم پرست اور مخلوطی

۱۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۶۸/۱۶۶

لیڈروں کی کوششیں بارآور نہ ہوئیں اور ہندوؤں نے ہندو مسلم مفاہمت کی طرف کوئی قدم نہ اُٹھایا۔

مسلمانانِ کشمیر ڈوگرا راج کے جبر واستبداد کے ماتحت انتہائی مصیبتناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کی انجمن کے ساتھ علامہ اقبالؒ کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا اور انگلستان سے واپس آکر وہ انجمن کشمیری مسلمانان کے سیکرٹری ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں بعض تازہ شکایات کی بنا پر لاہور میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں حکومتِ کشمیر کی نظم ونسق پر نکتہ چینی کی گئی۔ "انقلاب" اخبار نے کشمیریوں کے مصائب پر پے در پے مضامین شائع کئے اور بتایا کہ اس ریاست میں مسلمان اکثریت آبادی ہونے کے باوجود پرلے درجے کے مظلوم ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں، تعلیمی حالت سخت افسوسناک ہے، مذہبی آزادی نہ ہونے کے برابر ہے، بعض مساجد پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہے، گراں اور ناواجب ٹیکسوں کے بوجھ سے کشمیری مسلمان کی کمر ٹوٹی جا رہی، غرض کشمیری مسلمانوں کی زندگی کے پہلو پیش کر کے مہاراجہ سے استدعا کی جاتی تھی کہ وہ اپنی مسلم رعایا کی طرف توجہ خسروانہ مبذول کریں۔ اتنے میں ریاست کے وزراء نے "انقلاب" کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ اور "انقلاب" نے اس کی جواب میں کشمیری مسلمان، مظلوم کشمیر اور مکتوب کشمیر کے نام سے پے در پے ہفتہ وار پرچے نکال کر ہزاروں کی تعداد میں اندرون کشمیر بھیجنے شروع کر دیئے اسی دوران میں متعدد اشتعال انگیز واقعات کے باعث مسلمانان کشمیر میں

شدید اضطراب پیدا ہوگیا؛ گرفتاریاں، مظاہرے، فائرنگ، تشدد غرض ایک قیامت برپا ہوگئی، پنجاب کے مسلمان سخت مضطرب ہوئے۔ ایک طرف مجلس احرار نے داخلہ کشمیر کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ہزار ہا رضا کار جیلوں میں چلے گئے اور دوسری طرف مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعتِ احمدیہ کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانان کشمیر کو ان کے حقوق دلوائے جائیں۔ جو مسلمان کشمیر کے جیل خانوں میں محبوس تھے، ان کی قانونی امداد کے لیے علامہ اقبالؒ نے بعض نہایت معزز و مقتدر وکلاء کو کشمیر روانہ کیا۔ علامہ کے نہایت مخلصانہ تعلقات نواب حمید اللہ خان تاجدار بھوپال سے تھے اور تاجدار بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے، علامہ نے ان کے ذریعے سے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمیشن مقرر کیا۔ اس وقت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے، مسلم کانفرنس کو گلینسی کمیشن کی ترکیب پر اعتراض تھا؛ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاس عاملہ میں مسائل کشمیر کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کمیشن کے مسلمان ممبران کو مسلمانوں کی مشورہ کے بغیر نامزد کیا گیا ہے لہذا یہ کمیشن ناقابل قبول ہے، محمد عبد اللہ اور قاضی گوہر رحمان کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کو کمیشن کے سامنے پیش کریں اس کے ساتھ ہی کشمیر کے اسیران کی

۱ تفصیلات کے لیے دیکھو "سیاسی کارنامہ"۔ سرگزشت (سالک)، و سوانح چودھری غلام عباس

تکلیف و مصائب اور مسلم وکلا کے حدود ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا۔

علامہ اقبالؒ کمیٹی کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی مسلمانانِ کشمیر کے مسائل پر اظہارِ خیالات فرماتے رہے اور اسیرانِ کشمیر کی رہائی پر اصرار کرتے رہے۔ کشمیر کمیٹی اب تک کسی دستور کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی تھی اور صدر (یعنی مرزا صاحب) کو غیر محدود اختیارات دیئے گئے تھے لیکن جب تحریکِ کشمیر نے طول کھینچا تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی کا ایک باضابطہ دستور تیار کیا جائے۔ اس پر احمدیوں نے مخالفت کی کیونکہ وہ اس ترتیب دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ اختلاف پیدا ہوا، مرزا بشیر الدین محمود احمد نے صدارت سے استعفا دیدیا اور علامہ اقبالؒ ان کی جگہ عارضی طور پر صدر منتخب ہوئے۔ لیکن مرزا صاحب کے علٰحدہ ہو جانے سے ان کے احباب و مریدین نے جو کمیٹی کے اصلی کارکن تھے، کشمیر کمیٹی کے کام میں دلچسپی لینا ترک کر دیا اور یہاں کوئی اور کارکن تھا ہی نہیں لہٰذا علامہؒ نے بھی کمیٹی کی صدارت سے استعفا دیدیا اور کمیٹی ہی کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

گلینسی کمیشن کی سفارشات یہ تھیں کہ کشمیر میں پوری مذہبی آزادی ہو، عبادت گاہوں کو سرکاری قبضے سے نکال کر عوام کے سپرد کر دیا جائے۔ تعلیم عام کی جائے، ابتدائی مدرسے زیادہ کھولے جائیں، مسلم مدرسین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص عہدہ دار مقرر کیا جائے، تمام

ملازمتوں کا باقاعدہ اشتہار دیا جائے اور ہر فرقے کو مناسب حصہ دیا جائے؛
ان سفارشوں پر عمل ہوا۔

ریاست الور میں بھی مسلمانوں کی حالت بحد خراب تھی، ۱۹۳۲ء میں ان پر بھی بڑی آفتیں نازل ہوئیں انھوں نے اپنی ایک جماعت خادم المسلمین کے نام سے قائم کی تھی جو مسلمانوں کے حقوق کی حمایت کیا کرتی تھی، حکام الور نے اس انجمن کو ممنوع قرار دیدیا، مسلمانوں نے احتجاج کیا، جلوس نکالے، گولی چلی، مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کی، مہاجرین کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں، بعض مستقل شکایات یہ تھیں کہ مسجدوں پر حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا، اردو فارسی کی تعلیم مدرسوں میں بیس برس سے بند تھی، مذہبی تعلیم پر قیود عائد تھیں، ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت ہی کم حصہ دیا جاتا تھا، علامہ اقبال[۲] نے مسلم کانفرنس کے اجلاس ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں مسلمانانِ الور کی شکایات پیش کیں، ایک وفد مرتب ہوا جس کے رئیس مولوی شفیع داؤدی قرار پائے۔ حکام الور نے وفد کو باریاب ہونے سے انکار کر دیا، مجلس عاملہ مسلم کانفرنس نے ۸ جون کے اجلاس میں احتجاج کیا جس کا کچھ اثر نہ ہوا، پھر لارڈ ولنگڈن کی خدمت میں یادداشت بھیجی جس میں الور کے مظالم بیان کئے گئے، اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دنیا جانتی ہے مہاراجا الور اپنی ریاست سے بید خل کر دیئے گئے!

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اس پُرآشوب زمانہ میں جب سیاست ایک انقلابی موڑ پر پہنچ گئی تھی، مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کا فرض

ا۔ گلینسی کمیشن رپورٹ اقتباس ۔صفحہ ۵۱ ۲۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۸۵/۱۸۴

صرف علامہ اقبالؒ نے انجام دیا اور پورے ملک میں کوئی ایسا مسئلہ جو مسلمانوں کی حیاتِ سیاسی سے متعلق تھا، ان کی توجہ اور کوشش سے محروم نہ رہا مسلم لیگ بالکل بے روح اور بیکار ہو رہی تھی، مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے انتشار سے تنگ آکر انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ خلافت کمیٹی بھی افسردہ بلکہ مردہ ہو چکی تھی، مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان قوم پرست اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر گھروں میں بیٹھے مرثیہ پڑھ رہے تھے اور اقبالؒ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی پوری سیاست کے جہاز کا ناخدا بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہؒ اپنی مساعی میں کامیاب ہوئے۔ جداگانہ انتخاب کی بنیاد مستحکم ہو گئی، فرقہ وار فیصلہ زیادہ تر مسلمانوں کے منشا کے مطابق صادر ہوا کشمیر والور وغیرہ کے مسائل بھی بڑی حد تک حل ہوئے اور علامہ سیاسی مصروفیتوں کی کثرت کے باوجود دوسری ثقافتی سرگرمیوں سے بھی غافل نہ رہے۔

اس ہنگامۂ سیاست کے تذکرے میں جو چند واقعات اندراج سے چھوٹ گئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

۱۹۳۲ء ہی میں غازی رؤف پاشا (سابق وزیرِ اعظم ترکیہ) ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ان کے چھ لیکچر ہوئے۔ ایک لیکچر کی صدارت علامہ اقبالؒ نے فرمائی۔ شام کے وقت جب علامہ ڈاکٹر انصاری اور رؤف پاشا کے ساتھ جامعہ کے ہال میں داخل ہونے لگے تو غازی رؤف رک گئے اور حضرت علامہ سے کہا کہ آپ ہمارے

مقتدا و پیشوا ہیں، آپ آگے چلیے۔ رؤف پاشا کی تقریر کے بعد علامہ نے بھی ایک بصیرت افروز خطبے میں "اتحادِ اسلامی" کے نصب العین کی اہمیت واضح کی۔

دوسرے دن پھر علامہؒ نے ہی صدارت فرمائی۔ لوگ متوقع تھے کہ آج پھر فصیح و بلیغ خطبہ سننے میں آئے گا لیکن علامہؒ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے:

> جنگِ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: مجھے آجکل بالکل فرصت ہے اس لئے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔

اس سے چند ماہ بعد آپ پھر جامعہ ملیہ میں تشریف لے گئے، اس وقت آپ تیسری گول میز کانفرنس سے آ چکے تھے، آپ کی تقریر کا عنوان تھا "لندن سے قرطبہ تک"۔ شام کو آپ کے اعزاز میں جو دعوت ہوئی، اس میں مولانا اسلم جیراج پوری نے علامہ کے کلام اور ان کے علم و فضل اور ان کی خدماتِ اسلامی کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا۔ علامہؒ نے اپنی تقریر میں برگساں سے ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں نے فلسفۂ اسلامی کی بعض ایسی باتیں اسے بتائیں جن سے وہ اب تک بالکل بے خبر تھا اور اس بے خبری کی وجہ سے تاریکی میں سرگرداں تھا![1]

علامہ کی کتاب "جاوید نامہ" فروری ۱۹۳۲ء کو شائع ہو گئی اور حسب سابق

۱۔ "سیرتِ اقبال" طاہر فاروقی ۔ص ۴۰/۳۹

ملک کے مقتدر اخباروں نے اس پر شاندار آرا کا اظہار کیا۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور نے ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں "یوم اقبال" منایا، دو اجلاس ہوئے جن کی صدارت مسٹر جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر ایس۔ ایس بھٹناگر نے کی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم حکیم احمد شجاع، سید محمد عبداللہ، شیخ اکبر علی ارسطو، محمد دین تاثیر، مسٹر ایم۔ اے مجید، مسٹر ممتاز حسین نے انگریزی اور اردو میں مختلف موضوعات اقبال پر عالمانہ تقریریں کیں۔ ۷ مارچ کو نوریسنگ میں ایک دعوت چائے دی گئی۔ مقامی معززین کثرت سے موجود تھے۔ اس دعوت میں علامہ نے اس تحریک کی تحسین فرمائی جو مسلمان نوجوانوں میں ادبیاتِ اسلامی، اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق کے لیے پیدا ہوئی ہے۔[۱]

۱۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو خان ذکاالدین خان سشن جج کے اصرار پر علامہ اقبال، سید میلاد النبی کی تقریب میں جالندھر تشریف لے گئے۔ مسلمانوں نے ان کا شاندار جلوس نکالا، پھر ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں خان ذکاالدین خان نے اسلام اور تصوف پر ایک مقالہ پڑھا۔ سید حبیب نے تقریر کی اور پھر علامہ نے کوئی پون گھنٹے تک حضور سرورِ کائنات کی سیرت کے متعلق حقائق و معارف کے وہ دریا بہائے کہ اہلِ جالندھر کے ایمان تازہ ہوگئے۔ تیسرے پہر علامہ کے اعزاز میں پارٹی ہوئی۔ سپاسنامہ پیش کیا گیا جس کا علامہ نے برجستہ جواب دیا۔ شام کو واپس لاہور تشریف لے گئے۔

۱۔ انقلاب، ۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء

لندن کی ارسٹاٹلین (ارسطا طالیسی) سوسائٹی نے علامہؒ سے استدعا کی کہ کسی وقت ہمارے ہاں تشریف لا کر کسی فلسفیانہ موضوع پر لکچر دیجئے۔ علامہ نے مئی ۱۹۳۲ء میں یہ لکچر ختم کیا۔ اس کا عنوان تھا؟ Is Religion Possible[۱] (یہ لکچر انگلستان میں دیا گیا اور چھ لکچروں میں شامل ہو کر چھپ چکا ہے)۔

اگرچہ علامہ کی حق گوئی اور بیباکی سے حکامِ وقت بہت آزردہ تھے لیکن جب فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہو گیا اور آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اس کے صدر محترم کی ساکھ دنیائے سیاست میں بلند تر ہو گئی تو حالات کسی قدر رو براہ ہونے لگے اور جب میاں سر فضل حسین نے جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے، تیسری گول میز کانفرنس کے ممبروں میں علامہ کا نام بھی تجویز کیا تو حکومت بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن علامہ کو دعوت دینے پر آمادہ ہو گئی؛ چنانچہ آپ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لاہور سے بہ عزمِ یورپ روانہ ہو گئے، چونکہ آپکے عزمِ سفر کی اطلاع اہلِ شہر سے پوشیدہ رکھی گئی تھی، اس لئے صرف بیس پچیس ذاتی احباب و اعزہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔

تیسری گول میز کانفرنس کا آغاز ۷ انومبر کو ہونے والا تھا، علامہ اس سے ایک ماہ قبل روانہ ہوئے۔ مقصود یہ تھا کہ لندن پہنچنے سے پہلے ویانا، بوداپسٹ برلن وغیرہ کے علمی مراکز میں بھی دو دو چار چار دن قیام کرتے جائیں۔ فرنٹیئر میل کی روانگی سے قبل علامہ نے نمائندہ اخبارات کو یہ بیان دیا: لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس نہایت اہم ہوگا، فرقہ وار فیصلے نے ہمارے راستے

۱۔ مکاتیب اقبال ۳۰۸ / ۳۰۹

سے بہت سی مشکلات دور کر دی ہیں، اب ہمارا فرض ہے کہ باقی فیصلہ طلب مسائل کا حل دریافت کریں۔ میں مسلمانانِ ہند اور اپنے غیر مسلم ہموطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی پوری قوت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کر دیگا۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس حکمت عملی پر سختی سے کاربند رہیں جس کا اظہار مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں میں کیا جا چکا ہے۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کا یہ بیان کردہ اصول یاد دلادوں کہ

«فاذا عزمت فتوکل علی اللہ»[1]

لندن پہنچ کر علامہ اقبالؒ نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ لیکن تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کانفرنس میں زیادہ بحث وفاقِ ہند اور اس کے متعلقہ مسائل پر ہوتی رہی اور علامہ اقبالؒ نے وفاق کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر ہی دیا تھا کہ

> ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاقی ہی ہو) قائم ہی نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے بجائے براہِ راست لندن میں وزیرِ ہند سے ہو۔[2]

علامہ کے خیال کو عام طور پر قبول نہ کیا گیا، پھر علامہ اس وفاق کی تشکیل کے مباحثوں میں کیا حصہ لیتے؟ البتہ بعض اہل الرائے سے پرائیویٹ ملاقاتیں

۱۔ روزنامہ انقلاب ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء   ۲۔ پاکستان۔ مؤلفہ ڈاکٹر امبیڈکر ۳۲۹۔

کر کے اپنی اسلامی ہندو والی تجویز (خطبۂ صدارت الہ آباد مسلم لیگ) کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے علامہ کے اس تخیل کو "پاکستان" کا نام دے کر ایک "پاکستان نیشنل کانگرس" کی بنیاد بھی رکھ دی تھی اور اس کے پمفلٹ تمام سیاسی حلقوں میں تقسیم کیے جا رہے تھے، بعض اہلِ فکر و نظر اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے تھے؛ چنانچہ خود علامہؒ نے مسٹر جناح کے نام ایک خط میں لکھا ہے "مجھے یاد ہے انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل تمہاری ہی سکیم میں ہے لیکن اس کی بار آور ہونے میں ابھی پچیس سال کی مدت درکار ہے" (لیٹرز ٹو جناح)۔

لندن میں ایک نیشنل لیگ بھی قائم تھی جس کا مقصد عالمِ اسلامی میں دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا۔ اس انجمن کی صدر مس مارگریٹ فارکوہرسن تھیں (جن کے نام علامہ کے متعدد خطوط "مکاتیبِ اقبال" میں درج ہیں) نیشنل لیگ نے بھی ایک استقبالیہ ۲۵ نومبر کو دیا جس میں متعدد مقتدر برطانوی، گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور مولانا شوکت علی بھی شامل ہوئے۔ مس فارکوہرسن کی تقریر خیر مقدم کے بعد علامہ نے گول میز کانفرنس کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا اور فرمایا کہ اگر برطانیہ نے ہندوستان پر اعتماد کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ پر اعتماد کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے علحدگی سندھ کے متعلق ایک یادداشت ۲۲ نومبر کو پارلیمنٹ کے سب ممبروں کو ارسال کی!

۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو دارالعلوم انگلستان میں ایک تاریخی جلسہ ہوا جس میں

۱۔ "روزنامہ انقلاب ۲۱ و ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء

علامہ اقبالؒ کا استقبال کیا گیا، لارڈ ولینگٹن صدر تھے۔ علامہؒ نے اپنی عالمانہ تقریر میں مسلمانوں کے مطالبات کا خلاصہ یہ بیان کیا کہ مرکز میں ایک تہائی نشستیں، بلوچستان میں اصلاحات اور صوبائی خود اختیاری۔ ہندوستان اور ایشیا میں اسلام کی حیثیت واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مشرق و مغرب میں اتحاد کا قیام مسلمانوں کی تنظیم اور قوت پر منحصر ہے۔ سر آغا خاں اور دیگر مسلم ارکانِ وفد نے بھی تقریریں کیں، کرنل ایلین ممبر پارلیمنٹ نے اظہارِ تشکر کیا تھا ہی پارلیمنٹ کی طرف سے اسلامی مطالبات کی حمایت کا یقین دلایا۔!

تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ اقبالؒ پیرس پہنچے اور علمی حلقوں کے علاوہ برگساں سے ملاقات کی اور ان دونوں اکابرِ علم کے درمیان نہایت گہرے علمی مسائل پر مذاکرہ ہوا۔ اس کے بعد علامہ نے ہسپانیہ کا رُخ کیا، میڈرڈ یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے آپ سے درخواست کی کہ "ہسپانیہ اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقا" کے عنوان پر لکچر دیجیے۔ حضرت علامہ نے جو لکچر دیا وہ عام طور پر بیحد پسند کیا گیا، پروفیسر آسین نے جو "ڈیوائن کامیڈی اینڈ اسلام" کے مصنف ہیں، علامہ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیا۔ ہسپانیہ میں ایک عرب ریسرچ سکالر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے متعلق علامہ نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا، وہ اس وقت فقہ اسلامیہ پر ریسرچ کر رہے تھے۔ نہایت نیک نوجوان ہیں، مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے۔ ان سے کہیئے کہ نصیر الدین

۱۔ مکاتیب اقبال ۳۲۱/۳۲۲ ۲۔ روزنامہ انقلاب ۲۲ دسمبر ۳۲ء

طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے اقلیدس کے Parallel Postulate ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بالخصوص مطالعہ کریں۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہوگا کہ مسلمان ریاضی داں قرونِ وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ممکن ہے مکان کے ابعاد (DIMENSIONS) تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زمان و مکان کے قائل ہیں۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی کانٹ نے پیدا کیا تھا لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتے سے آشنا تھے۔ عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالے کا جو خاص طور پر زمان و مکان پر ہے، اپنے لکچروں میں ملخص بھی دیا ہے! اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے یورپ میں نام پیدا کریں گے![1]

علامہؒ اپنے سفرِ ہسپانیہ کے متعلق لکھتے ہیں "میں اپنی سیاحت اندلس سے بےحد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجدِ قرطبہ پر بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی![2]

علامہ نے ایک صحبت میں اسلامی فنِ تعمیر کی قوت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق

۱۔ مکاتیبِ اقبال دوم، صفحہ ۳۴۳، ۳۴۴ ۲۔ مکاتیبِ اقبال دوم، ۳۲۱

نظر آتا ہے؛ "قصر زہرا" دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، "مسجد قرطبہ مہذب دیوؤں کا ہے مگر "الحمرا" محض مہذب انسانوں کا"! پھر فرمایا: "میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی، دیوار پر ہو الغالب لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے، کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو! علامہؒ نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں، اس عمارت کے نگراں سے پوچھا، اس نے کہا: میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں! ادھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہؒ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔

ہسپانیہ سے علامہ اٹلی تشریف لائے، یہاں بھی علمی حلقوں نے آپکی پذیرائی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا، ڈاکٹر سکارپا نے جو ہندوستان میں اطالوی سفیر رہ چکے تھے اور علامہ کے بیحد معتقد تھے، متعدد استقبالی تقریبات کا اہتمام کیا؛ علاوہ بریں مسولینی نے خود خواہشِ ملاقات ظاہر کر کے علامہ کو مدعو کیا اور علامہ اس سے مل کر اس کی شخصیت خصوصاً اسکی آنکھوں کی مخصوص اور بے نظیر چمک سے بیحد متاثر ہوئے۔

فروری ۳۳ء میں علامہ اقبالؒ کوئی چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور آتے ہی ۲۶ فروری ۳۳ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں گول میز کانفرنس میں صرف اس مقصد کے لئے شریک ہوا تھا کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں دوسری اقوام میں مدغم نہ ہونے

۱۔ ملفوظات اقبال، بیان پروفیسر حمید احمد خاں، ۱۸۵

پائیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مسئلے کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی دوسری کارروائی میں حصہ نہیں لیا (ملفوظاتِ اقبال)۔ اس کے بعد مارچ ۳۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) کے نام سے شائع کر دیا۔ اس پر اربابِ سیاست نے نکتہ چینی کی اور علامہ اقبال رح نے بھی ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک بیان جاری کر کے قرطاس ابیض پر متعدد اعتراضات کیے۔* فرقہ وار مفاہمت کی کوشش بعض حلقوں میں اب بھی جاری تھی۔ ان میں سے ایک پنجاب کا فارمولا بھی تھا جس کے تین فقرے تھے۔ اول۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے حق رائے دہی میں ایسی ترمیمات کی جائیں جن کہ تینوں فرقوں کی آبادی و ووٹروں کی تعداد میں منعکس ہو۔ دوم۔ انتخابات مخلوط ہوں اور پورے صوبے کو علاقہ وار اور آبادی کی بنا پر یکساں حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کیا جائے۔ سوم۔ ہر فرقے کو ایسے انتخابی حلقے دیئے جائیں جن میں اس کے ووٹروں کا تناسب سب سے زیادہ ہو۔

اس کو خود سکھوں ہی کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے رد کر دیا اور ہندو اخباروں نے بھی اس پر نکتہ چینی کی۔ علامہ اقبال رح نے ۱۴ جولائی ۳۳ء کے بیان میں اس فارمولے پر تنقید کر کے اسے مضرت رساں ثابت کیا۔*

کانگرس نے فرقہ وار فیصلے کے متعلق نہایت مہمل رویہ اختیار کیا۔ وہ نہ اسے علی الاعلان قبول کر سکتی تھی کیونکہ ہندوؤں کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا اور نہ اس کو مسترد کر سکتی تھی، اس لئے کہ اس کے بعد قوم پرست مسلمان بھی اس کے

---

* تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ۱۷۵/۱۶۳

ساتھ نہ رہتے۔ چنانچہ اس نے یہی قرار دیا کہ کانگرس اس فیصلے کو نہ رد کرتی ہے نہ قبول کرتی ہے علامہ اقبال اس پر بیحد برہم ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو پرزور مشورہ دیا کہ اگرچہ اس فیصلے میں ہمارے بعض مطالبات منظور نہیں کیے گئے، لیکن تاہم ایک باعمل جماعت کی حیثیت سے وہ ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کہ اس فیصلے کو جرأت کے ساتھ قبول کریں اور اس کی حمایت کریں۔

ماہ ستمبر ۳۳ء میں اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ افغانستان کی طرف سے علامہ اقبالؒ، سید سلمان ندوی اور سر راس مسعود کو دعوت نامہ پہنچا کہ آپ حضرات چند روز کے لیے افغانستان تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائیں اور ہماری وزارت معارف کو کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیمات کو جدید اصول پر منظم کرنے میں مشورے دیں۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات اکتوبر کے آخری ہفتہ میں کابل پہنچ گئے۔ وہاں شاہی مہمان رہے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کو باریابی سے مشرف فرمایا۔ امرا و وزرا سے ملاقاتیں رہیں۔ انجمن ادبی کابل نے تمام اکابر ادبا، و فضلائے افغانستان کے ایک شاندار اجتماع میں معزز مہمانوں کو سپاسنامہ دیا۔

کوئی تین ہفتے کے قیام کے بعد علامہ اقبالؒ غزنی اور قندہار گئے۔ غزنی کے آثار میں سلطان محمود غزنوی، حکیم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے والدِ محترم کے مزارات پر بطور خاص فاتحہ خوانی کی۔ پھر قندہار پہنچ کر خرقہ شریف کی زیارت کی۔ واپسی پر علامہؒ نے مثنوی "مسافر" میں اپنے سفر افغانستان کے جذبات واحساسات نظم کیے۔

۱۹ اکتوبر اور ۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبالؒ نے افغانستان کی ایک مجوزہ یونیورسٹی اور افغانستان کے حالات و کوائف کے متعلق نہایت حوصلہ افزا اور خیر خواہانہ بیانات شائع کیے۔[۱]

اگرچہ اس زمانے میں علامہ اقبالؒ اکثر علیل رہنے لگے تھے اور آنکھوں میں بھی موتیا اتر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ان کی علمی مصروفیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان سب میں زمان و مکان کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی ہے۔ فلاں فلاں امام نے زمان پر کیا لکھا ہے۔ امام رازی کی مباحث شرقیہ کہاں سے ملے گی اتفاق فی ماہیۃ الزمان بتسویلات فلسفہ اور شرح مواقف دیکھ چکا ہوں۔ نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان رام پور کے کتب خانے میں مل جائے گا۔ ملامحب اللہ بہاری کی جوہر فرد اگر آپ کے پاس ہو تو عاریتاً بھیج دیجیے۔ غرض ملک بھر میں زمان و مکان حائل کے متعلق اکابر اسلام کی کتابوں کا تجسس جاری تھا۔ اور مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ ان مسائل کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے فضلا جس نتیجے پر آج پہنچے ہیں وہ مسلمانوں کے اکابر علم کو صدیوں پہلے معلوم تھا۔ غرض علامہ کا مقصد ہر حال میں یہ ہی تھا کہ ہر شعبۂ علم میں مسلمانوں کی برتری کا سکہ جمایا جائے۔

نواب سر ذوالفقار علی خاں علامہ اقبالؒ کے قدیم ترین اور مخلص دوستوں میں سے تھے اور ان کے تعلقات حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ بے تکلف اور

۱۔ حرف اقبال ۲۳۲/۲۲۹

مخلصانہ تھے۔ نواب صاحب نے اس زمانے میں علامہ کے کمالات شاعری پر انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی: علامہؒ کے حاسد ہمیشہ حکام اعلیٰ کو علامہ سے بدظن کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں کا سدباب ذوالفقار علی خاں کرتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح علامہ عدالتِ عالیہ کے جج یا کوئی اور ایسے ہی اونچے عہدہ دار بن جائیں۔ لیکن خدا جانے کیا پیچ پڑا کہ بعض خود غرض افراد کی دراندازیوں کی وجہ سے ان دونوں دوستوں کے درمیان بعض غلط فہمیاں حائل ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ان دنوں ایک دفعہ شملہ گئے تو ملک فیروز خان نون کے ہاں ٹھہرے۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا تو روئے اور کہا کہ میرے دوست کا کسی دوسری جگہ قیام کرنا کبھی میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مرزا جلال الدین دونوں کے مشترک دوست تھے۔ انھوں نے ان کے درمیان مصالحت کرانے کا انتظام کیا اور ایک تاریخ مقرر کر کے دونوں کو دعوتِ چائے دیدی لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا، اس تاریخ سے قبل نواب صاحب اچانک سخت بیمار پڑ گئے اور پیشتر اس کے کہ وہ دونوں ان سے ملتے۔ وہ اپنے پیدا کرنیوالے سے جاملے۔ علامہ اور مرزا جلال الدین دونوں کو اس مدۃ العمر کے مخلص دوست کی وفات (اور پھر اس قدر ناگوار حالات میں) پر شدید صدمہ ہوا۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ کم از کم نواب صاحب کی نمازِ جنازہ میں تو شامل ہو جائیں، چنانچہ دونوں موٹر کار میں مار امار کر کے مالیر کوٹلہ پہنچے لیکن میت اس سے قبل سپردِ خاک کی جاچکی تھی۔ ناچار باول حسرت زدہ فاتحہ پڑھ کر واپس آگئے۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کو علامہ اقبال سے نہایت گہری عقیدت تھی

ان سے بطورِ خاص اشعار لکھواتے۔ اور ان کے دستخط کو حرزِ جاں بنا کر رکھتے۔ احمد یار خاں کی شادی میاں غیاث الدین کے والد کے ذریعے سے ہوئی تھی علامہ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں برات میں شریک تھے۔ احمد یار خاں وقتاً فوقتاً علامہ کو تحائف بھیجا کرتے تھے اور بعض اوقات بہت اچھی دودھ دینے والی گائے بھینسیں تک پیش کر دیتے تھے۔ علامہ کو احمد یار خاں کے ساتھ ان کے خلوص کی وجہ سے بےحد لگاؤ تھا۔ یونینیسٹ پارٹی کے شائی ہونے کے باوجود اس کے متقدر رکن یعنی احمد یار خاں کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتے تھے۔

علامہ اقبالؒ کچھ مسلمانوں کے انتشار کی وجہ سے اور کچھ اپنی ناسازیٔ طبع کے باعث مسلم کانفرنس کی صدارت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور سیاسیات سے زیادہ تر کنارہ کش ہی رہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کو لکھا: "میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بےحد دردمند ہوں۔ اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا۔"[2] اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مکتوب میں تحریر فرمایا: "گذشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے دردمند کر دیا ہے۔ اس لیے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا، نہ پٹنہ، نہ کان پور۔"[3]

۱۔ ملفوظاتِ اقبال بیان مرزا جلال الدین ۱۳۰/۱۲۹ ۲۔ مکاتیب اقبال اول ۱۲۹

۳۔ مکاتیب اقبال اول ۳۴۳

پانچویں فصل

۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء

اسیرانِ کشمیر کی قانونی امداد

اگرچہ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں سیاسیات سے علی العموم کنارہ کش اور گوشہ گیر ہو رہے تھے لیکن اسیرانِ کشمیر کے مقدمات کی پیروی کے لئے اپنے وکیل دوستوں کو برابر آمادہ کر رہے تھے۔ ملک برکت علی ایڈووکیٹ علامہ سے پورا تعاون کر رہے تھے لیکن چونکہ فروری ۱۹۳۴ء میں انھیں انتخابات در پیش تھے اس لئے صوبہ بہار کے وکیل مسٹر نعیم الحق کو حضرت علامہؒ نے بعض مقدمات کی پیروی پر آمادہ کر لیا تھا۔ شیخ عبدالمجید ایڈووکیٹ (صدر کشمیر کانفرنس جموں) ان تمام قانونی مساعی کے مرکز تھے اور علامہ نے مسٹر نعیم الحق کو بھی انہی کے سپرد کیا تھا۔ جب دو مقدموں کی پیروی کا کام مسٹر نعیم الحق کو تفویض کیا جا چکا تو میرپور کے دوسرے مقدمے کے کاغذات بھی علامہ کو موصول ہو گئے۔ وہ یہ مقدمہ بھی مسٹر نعیم الحق ہی کے سپرد کر دینا چاہتے تھے لیکن دفعتاً معلوم ہوا کہ اس کی پیروی چودھری ظفر اللہ خاں کریں گے۔ چونکہ اس وقت تک علامہ کو کشمیر کمیٹی کے سلسلے میں احمدیوں سے سوءِ ظن پیدا ہو چکا تھا، اس لئے لکھتے ہیں:

چودھری ظفر اللہ خاں کیوں کر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں!

حالانکہ شیخ محمد عبداللہ (شیرِ کشمیر) اور دوسرے کارکنانِ کشمیر مرزا محمود احمد صاحب اور ان کے بعض کارپردازوں کے ساتھ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ روابط رکھتے تھے۔ ان روابط کا کوئی تعلق عقائدِ احمدیت سے نہ تھا۔ بلکہ ان کی بنا محض یہ تھی کہ مرزا صاحب کثیر الوسائل ہونے کی وجہ سے تحریکِ کشمیر کی امداد کئی پہلوؤں سے کر رہے تھے اور کارکنانِ کشمیر طبعاً ان کے ممنون تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں بھی یقیناً مرزا صاحب ہی کے اشارے سے مقدمے کی پیروی کے لئے گئے ہونگے۔

علالت کا آغاز اس میں شک نہیں کہ علامہ کی صحت مدت سے خراب چلی آ رہی تھی۔ پانچ سات برس پیشتر انھیں شدید درد گردہ کا دورہ ہوا۔ بعض احباب کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب دہلوی کا علاج کرایا گیا جس سے معتد بہ فائدہ ہوا لیکن دو تین سال سے ان کے قوا میں نمایاں انحطاط پیدا ہو رہا تھا اور سالِ گذشتہ سے تو بینائی پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی ایک آنکھ تو قریب قریب بیکار ہو چکی تھی جب وہ دو سال کے تھے لیکن چونکہ دوسری آنکھ غیر معمولی طور پر قوی تھی اس لئے عمر بھر پڑھنے لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اب چند ماہ سے اسی آنکھ میں موتیا اتر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۴ء ہی وہ منحوس سال تھا جس میں علامہ کی خطرناک علالت

۱۔ مکاتیب اقبال ۴۳۵

کا آغاز ہوا۔ ۸ جنوری ۱۹۳۴ء کو عید الفطر کا دن تھا۔ علامہ اقبال، چودھری محمد حسین، جاوید میاں اور علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے۔ ایک تو اس دن یوں بھی شاید سردی تھی اس پر علامہ محض شلوار کوٹ پہنے ہوئے تھے، نہ کوئی کمبل تھا نہ گلوبند، موٹر کار میں جاتے آتے وقت ٹھنڈی ہوا لگی۔ پھر شاہی مسجد پر اتر کر دروازے سے محرابِ مسجد تک ننگے پاؤں اس فرش پر دو دفعہ چلنا پڑا جو شدتِ سردی سے برف ہو رہا تھا۔ غرض سردی کے اثر سے بچنے کا کوئی تردد نہ کیا گیا۔ واپسی پر آپ نے اپنے والدِ مرحوم کی تقلید میں دہی ڈال کر سویاں کھائیں۔

طبیعت میں بلغمیت پہلے ہی سے تھی، گلا ہمیشہ سے خراب تھا، عید کے دوسرے دن ان کو شدید نزلے کی شکایت ہو گئی۔ علاج ہوتا رہا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ علی بخش کا بیان ہے کہ اس تکلیف کو شروع ہوئے پندرہ دن گزرے تھے کہ شب کو میری آنکھ دفعتاً کھل گئی۔ اس وقت کوئی ڈھائی بجے کا عمل ہو گا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب چارپائی پر بیٹھے کھانسی سے بے حال ہو رہے ہیں۔ صبح تک یہی حالت رہی اب ان کے لیے مسہل تجویز کیا گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ کھانسی تو جاتی رہی مگر گلا بیٹھ گیا۔

آواز بیٹھ گئی اور یہ گلا ایسا بیٹھا کہ پے در پے یونانی، ڈاکٹری اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود اس میں کوئی فرق نہ آیا۔ انہی دنوں ڈاکٹر انصاری نے خواہش ظاہر کی کہ بہت وہی جامعہ ملیہ میں جو لیکچر دے رہے ہیں، ان کی صدارت علامہ اقبال کریں۔ علامہ نے علالت کا عذر کیا۔ سید نذیر نیازی

ان دنوں جامہ میں تھے جب وہ اپریل میں لاہور آئے تو ۔

میں ان کے زرد زرد چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ آواز نہایت کمزور تھی جیسے کوئی سرگوشیاں کرتا ہو اٹھنے بیٹھنے میں ضعف و نقاہت کا اظہار ہوتا تھا۔

اس کے بعد نیازی صاحب نے مفصّل کیفیت دریافت کی تو علامہ نے بتایا کہ ایکسرے کیا گیا ہے اس سے پتہ چلا ہے کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے اور ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ زندگی خطرے میں ہے۔ اس پر نیازی صاحب نے کہا کہ اس سے قبل درد گردہ کی وجہ سے اپریشن کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا حکیم نابینا صاحب نے آپکا نہایت معجز نما علاج کیا تھا۔ موجودہ حالت میں بھی ان سے کیوں مشورہ نہ کیا جائے۔ علامہ نے نیازی صاحب کے اس خیال کو پسند کیا۔ اور کہا کہ آپ دہلی جاتے ہی حکیم صاحب سے میری علالت کا مفصّل ذکر کریں چنانچہ نیازی صاحب نے ذکر کیا اور حکیم صاحب نے علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں نے تو ملاحظہ و معائنہ کے متعدد نظریئے قائم کئے۔ لیکن حکیم صاحب اسی رائے پر جمے رہے کہ اعصاب میں برودت ہے۔ قلب ضعیف ہے۔ جگر میں حدت پیدا ہوگئی ہے۔ ہلکا سا دمہ ہے۔ بلغم کے انجماد کو ڈاکٹروں نے غلطی سے رسولی سمجھ لیا ہے۔

علامہؒ نے اس زمانے میں احباب کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ڈاکٹروں کے نظریئے بیان کئے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ مجھے لنڈن یا ویانا جانیکا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ لیکن میں حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر نہیں جا سکتا۔ علاوہ بریں یورپی علاج کیلئے

روپیہ کافی چاہیئے۔ جون کے آغاز میں علامہ ایک دن کے لیے خود بھی دہلی گئے۔ حکیم نابینا صاحب نے ان کی حالت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دوائیں جاری رہیں۔ علامہؒ کی صحت روز بروز بہتر ہو رہی تھی۔ اور لوگ اسے طب یونانی کا معجزہ سمجھتے تھے۔ لیکن آواز کی حالت بدستور رہی۔

بدپرہیزی

علامہ کو اپنی صحت پر اس قدر اعتماد پیدا ہو گیا کہ وہ روڈس لیکچرز کیلئے آکسفورڈ جانے کو تیار ہو گئے۔ جن کے متعلق وہ لارڈ لوتھین سے وعدہ کر چکے تھے۔ پھر جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے انکو تشریف آوری کی دعوت دی۔ جرمنی سے اطلاع موصول ہوئی کہ ترکی کی طرف سے عنقریب دعوت آنے والی ہے۔ اگر علامہؒ حکیم صاحب کی ہدایت پر پوری طرح عمل کرتے رہتے تو ان کی حالت صحت میں ترقی جاری رہتی اور ممکن تھا کہ وہ یورپ اور جنوبی افریقہ کا سفر اختیار کر سکتے۔ لیکن پرہیز کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے کمزور رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دوا ہو یا غذا ایک خاص معیار نفاست مدنظر تھا مثلاً حکیم صاحب نے کہا کہ مغز عصفور یا مغز خرگوش مفید رہے گا۔ لیکن علامہؒ نے کہا معاذ اللہ! مغز تو ایک طرف رہا مجھے تو دل، کلیجی، گردے وغیرہ بھی کھانے سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ غرض مغز کسی صورت میں استعمال ہی نہیں کیا اس کے علاوہ ایک خط مورخہ ۲۴ جون میں لکھتے ہیں۔

> آواز میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ ترقی معکوس ہے.... اس کے سبب تین ہو سکتے ہیں (۱) میں نے دہی کھایا اور لسی پی۔ (۲) فالودہ پیا برف ڈال کر (۳) دوا کی خوراک بڑھ جانے

سے تو ایسا نہیں ہوا۔

سفرِ ہند لیکن چونکہ عمومی صحت اچھی تھی، اس لئے شدید گرمیوں میں سرہند شریف جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیونکہ جب جاوید پیدا ہوا تھا، علامہؒ نے عہد کیا تھا کہ ذرا بڑا ہو لے تو اسے حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا۔ ۲۹ جون کو سرہند شریف گئے اور ۳۰ جون کو واپس آ گئے۔ ۲ جولائی کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد و شیریں ہے۔ سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا شہر فسطاط یاد آ گیا جس کی بنا حضرت عمر بن العاص نے رکھی تھی اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا۔

اس کے بعد علامہؒ کو یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں کا وہ رسولی والا نظریہ بالکل غلط ہے۔ ۵ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں کہ .... کہتے ہیں کہ ٹیومر یا گروتھ کا نظریہ صحیح نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عام صحت اسقدر اچھی نہ ہوتی۔ بلکہ اس کی حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی۔

عام صحت عمدہ اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے سید نذیر نیازی کو جتنے خطوط لکھے ان میں یہ لکھا کہ اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس شش ماہ بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا۔ کیوں کہ

اس بیماری نے حکیم صاحب کی وہ ادویہ استعمال کرنیکا موقع پیدا کیا جنہوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا کہ تمام عمر میری صحت کبھی ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے مگر تعجب ہے آواز میں کوئی تبدیلی نہیں۔"

حکیم نابینا صاحب کا یہ ارشاد تھا کہ ہمیں سب سے پہلے علامہ کے قلب اور اعصاب کی تقویت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ صحت درست ہو گئی تو گلا خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اس کیلئے وقت چاہیے۔ عام لوگوں کی کیفیت سب کو معلوم ہے کہ مریض کو اپنے نسخوں اور ٹوٹکوں سے پریشان کرتے ہی رہتے ہیں اور علامہ ان ٹوٹکوں کا تعاقب شروع کر دیتے تھے۔ مثلاً

"کہتے ہیں کشمیر کی پرانی گلقند اس مرض کے لئے اکسیر ہے۔"

"جراحوں کے ایک پرانے خاندان کے پاس شرطیہ لیپ ہے۔"

"مشک کا استعمال کیسا رہے گا۔"

"عراق کے ایک ترک طبیب کے پاس شرطیہ علاج ہے۔ تنباکو میں چرس رکھ کر کھلائی جائے۔ شکر کی بجائے گڑ استعمال کیا جائے۔ دو تین روز میں آواز صاف ہو جائیگی۔"

حکیم صاحب علامہؒ کی ان نئی نئی تجویزوں سے بہت پریشان ہوتے اور ان کے پاس خاطر سے (لیکن محض برسبیل دفع الوقتی) کوئی لیپ یا آواز کشا گولیاں بھیجدیتے۔

چھوٹے چھوٹے عوارض ان دنوں علامہ نے ایک دو نئی شکایتیں

محسوس کیں۔ وسط اگست میں ان کا سر دفعتاً چکرا گیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یہ غالباً ابتدائی علامت موتیا بند کی تھی۔ دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد رہنے لگا جو روغن اوجاع کی مالش سے دور ہو جاتا لیکن سال چھ مہینے کے بعد اس کا دورہ ضرور ہو جاتا۔ کبھی کبھی دن میں ایک آدھ ہچکی آجاتی جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چیخ کی صورت اختیار کر لی لیکن چونکہ عام صحت بہتر ہو رہی تھی، اس لئے علامہؒ ان چھوٹے چھوٹے عوارض کو وقعت نہ دیتے تھے۔

اس زمانے میں علامہؒ کو اپنی صحت کی طرف سے اس قدر اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنے مشاغلِ ادبی کو از سرِ نو شروع کر دیا۔ اوّل سیاحتِ افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو "مسافر" کے عنوان سے مرتب کیا۔ بالِ جبریل کے بعض اجزا ابھی نامکمل پڑے تھے ان کی ترتیب و تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ سید نذیر نیازی نے ان کے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں کر رکھا تھا جس کی نظرِ ثانی حضرت علامہؒ خود کرنا چاہتے تھے۔ خالص اسلامی ادبیات کی تخلیق کے لئے ایک ادارہ نشر و اشاعت کے قیام پر بھی غور کر رہے تھے۔

جاوید منزل کی تعمیر ۱۹۳۴ء کے اواخر میں علامہؒ نے میو روڈ پر سات کنال کا ایک قطعہ اراضی خریدا اور اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو سیالکوٹ سے بلوا کر اس قطعے پر کوٹھی تعمیر کرانے کا کام سپرد کیا۔ شیخ صاحب نے نہایت محنت، انہماک اور نگرانی سے یہ کوٹھی بنوائی۔ علامہؒ نے اس کو آغاز سے انجام تک جا کر نہیں دیکھا بس اسی دن گئے جب کوٹھی بن کر مکمل

ہوگئی۔ وصیت کے متعلق علامہؒ اپنے معتمد رفیق چودھری محمد حسین کو ضروری ہدایات دے چکے تھے اور چودھری صاحب کے نام ایک خط بھی لکھ چکے تھے جس میں بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ علی بخش کے نام چند ضروری ہدایات بھی شامل تھیں۔ آخر میں مسلمانوں سے دعائے خیر کی استدعا کی تھی۔

۱۸ اگست کو جب حضرت علامہؒ علی گڑھ جاتے ہوئے دہلی سے گزرے اور سید نذیر نیازی ان سے اسٹیشن پر ملے تو علامہ کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی واپسی پر انہوں نے حکیم نابینا صاحب سے ملاقات فرمائی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی!

بجلی کا علاج

حضرت علامہؒ کو سر سید کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود سے بڑی الفت تھی اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ علامہ بھوپال تشریف لا کر بجلی کا علاج کرائیں جس کا بہترین انتظام بھوپال ہی میں ہے۔ چنانچہ علامہ اوائل جنوری ۱۹۳۵ء میں دہلی پہنچے۔ وہاں خالدہ خانم ادیب نے جامعہ ملیہ میں ایک لکچر دیا جس کی صدارت علامہؒ نے کی۔ اور اس کے بعد بھوپال روانہ ہو گئے۔ یہاں اوائل مارچ تک قیام رہا۔ یعنی کوئی چار ہفتے وہاں مقیم رہے۔ علامہ بھوپال کے مناظر اور اس کی پاکیزگی ہوا کے بیحد مداح اور اپنے ڈاکٹروں کی مہربانیوں کے بیحد احسان مند تھے ۵ فروری ۳۵ء کو انھوں نے سید نذیر نیازی کو لکھا کہ طبی معائنہ نہایت مکمل ہوا جس سے حکیم صاحب ہی کی

۱۔ اس فصل کی زیادہ تر معلومات سید نذیر نیازی کے رسالہ "اقبال کا مطالعہ" کے آخری باب سے ماخوذ ہیں۔

بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ آج گیارہ بجے ماورا بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوگا۔

بھوپال سے واپسی پر آپ دہلی میں دو روز ٹھہرے۔ حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور علاج انہیں کا جاری رکھا۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ برقی علاج خاصی مدت تک جاری رہے گا تو آواز پر اثر پڑے گا۔

والدۂ جاوید کا انتقال

علامہؒ کی بیگم یعنی والدۂ جاوید یوں تو سالہا سال سے مریض چلی آتی تھیں اور جگر و طحال کی شکایات دس سال سے تھیں لیکن اپریل ۳۵ء میں ان کو میعادی بخار ہوا جس سے حالت بحد اندیشناک ہوگئی۔ آخر ۲۴ مئی کو آپ نے لکھا:۔

کل شام والدہ جاوید اس جہاں سے رخصت ہوگئیں ان کے آلام و مصائب کا اور میرے اطمینانِ قلب کا خاتمہ ہوا۔ اللہ فضل کرے۔

"ہر چہ از دوست می رسد نیکوست"

والدۂ جاوید کی وفات اس اعتبار سے اور بھی زیادہ دردناک تھی کہ انھیں میو روڈ پر اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ہوئے ابھی تین ہی دن گزرے تھے۔ والدۂ جاوید قبرستان بیبیاں پاکدامناں (ایمپرس روڈ، لاہور) میں دفن کی گئیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر ان کی پختہ قبر موجود ہے جس پر یہ قطعۂ تاریخ ثبت ہے:۔

یا حی و یا قیوم

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید — لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبالؔ نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"

۱۳۵۴ھ ہجری

بھوپال سے وظیفہ

یہ وقت علامہ پر بڑا نازک تھا. چار سال سے وکالت کا سلسلہ بند تھا. کسی طرف سے آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا. کتابوں سے جو روپیہ وصول ہوا تھا، وہ جاوید منزل کی تعمیر پر خرچ ہو چکا تھا. اپنی طبیعت کئی سال سے ناساز تھی، بیگم بے وقت ساتھ چھوڑ گئیں. بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ بظاہر لاینحل نظر آتا تھا. اگر چاہتے، تو گزشتہ چند سال کی شہرت و ناموری سے فائدہ اٹھا کر لاکھوں روپے جمع کر لیتے. کسی بڑے عہدہ پر فائز ہو جاتے. لیکن اس درویش خدا مست نے کبھی دولت و جاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں روزمرہ کی معیشت تنگ دشوار ہو گئی. اس موقع پر نواب حمید اللہ والیٔ بھوپال نے اپنے تعلق خاطر اور قدر دانیٔ خدمتِ اسلامی کے باعث حبیب خاص سے حضرت علامہؒ کا پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ حین حیات مقرر کر دیا. مئی ہی میں بیگم کا انتقال ہوا اور اسی مہینے سے بھوپال کا وظیفہ شروع ہوا.

۵ جولائی کو علامہؒ نے پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا تاکہ برقی علاج جاری رہے سر راس مسعود اور ان کی بیگم صاحبہ علامہ کی آسائش اور خاطرداری میں انتہائی خلوص و یگانگت کا سلوک روا رکھتے تھے. بھوپال سے واپسی پر علامہؒ بتایا کرتے تھے کہ آواز میں خفیف سی ترقی ہے اگر پانچ چھ مزید کورس علاج کے پورے ہو گئے تو آواز کھل جائے گی. اب یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی ڈاکٹر جمعیت سنگھ آ کر قلب اور پھیپھڑوں کا معائنہ کر جاتے. حکیم نابینا کا علاج اب بھی جاری تھا لیکن علامہ ان تمام علاجوں سے بیحد اکتائے ہوئے تھے کیونکہ وہ کسی فوری اکسیر کے خواہاں تھے

اور میڈیکل سائنس اس معاملے میں عاجز تھی۔

پانی پت میں اقبال اکتوبر ۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب تھی۔ چونکہ نواب صاحب بھوپال تشریف لا رہے تھے، اس لئے علامہؒ بھی پانی پت پہنچے اور نواب صاحب کے سامنے جلسے میں یہ اشعار پڑھے۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الفت تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بہ جاں ہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

علامہؒ ہمیشہ ارادے باندھتے رہتے تھے کہ فلاں مہینے انگلستان جاؤں گا، فلاں وقت ویانا جا کر علاج کراؤں گا، روڈس لکچر بھی ہو جائیں گے اور صحت کے متعلق بھی اطمینان ہو گا۔ لیکن اس مرتبہ پانی پت کا سفر کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنے کی اہلیت نہیں۔

ضرب کلیم چونکہ برقی علاج کے لئے بھوپال جانا ضروری تھا، اس لئے مارچ ۳۶ء کے اوائل میں دہلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ دہلی کے ہر سفر میں علامہؒ کے عاشق زار سردار صلاح الدین سلجوقی ان کو ایک دو روز

کے لیے روک لیتے اور مخصوص اور خوش ذوق اصحاب کا ایک پاکیزہ حلقہ حضرت علامہؒ کے ارشادات اور علامہ سلجوقی کی بذلہ سنجیوں اور شعر خوانیوں سے بہرہ اندوز حلاوت ہوتا۔ ۹ ۱رپریل کو علامہؒ بھوپال سے واپس آگئے اور "ضرب کلیم" شائع فرمائی اور چند ہی ماہ بعد ستمبر میں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔

۱۹۳۶ء کی سردیوں میں علامہؒ کی طبیعت فی الجملہ بہتر تھی لیکن چارپائی سے اٹھ کر دو قدم چلتے، بلکہ غسلخانے میں اپنے ہاتھ سے اپنے بدن کو ملتے تو اتنے ہی میں ہانپنے لگتے اور سانس پھول جاتا۔ اب حکیم نابینا صاحب کے علاوہ شفاء الملک حکیم محمد حسین قریشی کا علاج یا مشورہ بھی شاملِ حال تھا اور علامہ کو ان کی علمیت اور حذاقت پر پورا اعتماد تھا۔

علامہ اقبالؒ ۱۹۳۶ء میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ ان کی وہ آواز بیٹھ چکی تھی جس کے شیریں نغمے سالہا سال تک فرزندانِ توحید کے لیے فردوس گوش رہے تھے۔ سٹیج پر ایک کرسی ڈال کر اس پر علامہ بٹھا دیئے گئے تاکہ مسلمان ان کی زیارت سے شادکام ہوں اور علامہؒ کے ارشاد پر محمد صدیق اور محمد امین نے ان کے چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے:

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　　خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

مسلم لیگ کا احیا ۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ ایک جسدِ بے روح تھی۔ اگر ملک کی فضا میں اسلامی سیاست کا کچھ غلغلہ باقی تھا تو وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اس کے صدرِ محترم کی وجہ سے تھا۔ آخر اسی سال

مسٹر محمد علی جناح اپنی خلوت انگلستان سے چار سال بعد واردِ ہندوستان ہوئے اور مسلم لیگ کی جدید ساخت پرداخت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء میں جدید آئین نافذ ہوگیا اور انتخابات سر پر آگئے۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو ان مساعی کے رائیگاں ہوجانیکا خطرہ تھا جو سالہا سال سے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے لئے انجام دے رہے تھے۔ اس لئے مسٹر جناح نے ملک بھر کا دورہ شروع کر دیا۔ لیکن اگر انہیں کچھ کامیابی ہوئی تو وہ انہی صوبوں تک محدود تھی جن میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اکثریت کے صوبوں کی کیفیت یہ تھی کہ پنجاب میں سر فضل حسین یونینسٹ کے استحکام کی فکر میں تھے۔ بنگال میں مولوی فضل الحق۔ آسام میں سر سعد اللہ، صوبہ سرحد میں سر عبد القیوم اپنی اپنی جماعتیں لئے بیٹھے تھے۔ علامہ پنجاب میں مسٹر جناح کے لئے کام کر رہے تھے۔ اگرچہ اکثریت والے صوبوں کے کارکن مسٹر جناح کو بار بار یقین دلاتے تھے کہ ہم لوگ مسلمانوں کے حقوق کے معاملہ میں قطعی طور پر مسلم لیگ کے ہم زبان ہیں لیکن ہمارے لئے اپنے صوبوں میں انتخابات کا میدان جیتنے کے لئے جتن ضروری ہونگے ان کی ہمیں اجازت دے دیجئے۔ لیکن مسٹر محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ تمام مسلمانانِ ہند کا ایک ہی سیاسی ادارہ ہونا چاہیئے اور کسی قسم کی مقامی اور صوبائی وفاداریاں مستحسن نہیں سمجھی جاسکتیں۔

اقبالؒ صدر صوبہ لیگ

مسٹر محمد علی جناح نے پنجاب میں میاں فضل حسین کو مسلم لیگ کے صوبائی پالیمنٹری بورڈ بنانے کی دعوت دی۔ لیکن چونکہ میاں صاحب ایک غیر فرقہ وار یونینسٹ پارٹی

کے لیڈر تھے جسمیں ہندو مسلم سکھ زمیندار شامل تھے اور انہیں اسی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا تھا۔ لہٰذا میاں صاحب نے مسٹر جناح کی پیش کش مسترد کر دی مسٹر جناح نے یہ کام علامہ رح کے سپرد کیا۔ جو اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی علالت کے باوجود لبیک کہی۔ ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ طلب کیا جس میں علامہ دوبارہ صدر اور خان غلام رسول خاں بیرسٹر جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں پنجاب کے دیہات اور ان کے زمیندار یونینیسٹ پارٹی کے قبضہ میں تھے اور شہری مسلمان مجلسِ احرار اور مجلسِ اتحادِ ملت کے جلسوں کی زینت ہوا کرتے تھے مسلم لیگ زیادہ تر کسمپرسی کی حالت میں تھی۔

خطوط بنام جناح

حضرت علامہ رح اب ضعف اور علالت کے باعث مستقل طور پر صاحبِ فراش ہو چکے تھے۔ بینائی روز بروز جواب دے رہی تھی لیکن وہ دن رات پیش نظر مقاصد کے لئے کوشاں تھے۔ مسٹر محمد علی جناح کے نام علامہ رح کے جو خطوط بہت مشہور رہے، اسی زمانہ میں لکھے گئے تھے۔ وہ جہاں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لئے شبانہ روز محنت کرتے تھے، وہاں لیگ کو بھی عوامی جماعت بننے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو انہوں نے مسٹر جناح کو لکھا:۔

> لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑیگا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنھوں نے ابھی تک معقول وجہ

کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں
کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لئے کوشاں نہ
ہو، عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی *

انھوں نے مسٹر جناح کو جتنے خطوط لکھے، ان کا مفاد یہی تھا کہ مسلم ثقافت کی برتری ثابت کیجیے، مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنایئے، مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیجیے، مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے علحدہ وفاق کا قیام ضروری ہے۔ ۲۱، جون کو علامہ نے مسٹر جناح کے نام ایک پر زور اور یادگار خط لکھا جس میں تحریر فرمایا:۔

مسٹر جناح پر اعتماد آج ہندوستان میں آپ ہی وہ مسلمان ہیں جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفانِ بلا میں صحیح و محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے *

اس خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی اور توہینِ مذہب کے واقعات اور مسلمانوں کی لاعلاج تنگدستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی بات پر زور دیا ہے کہ ایک پرامن ہندوستان حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ لسانی، مذہبی اور نسلی میلانات کی بنا پر ملک کو از سرِ نو تقسیم کر دیا جائے *

شمال مغربی ہند پر اصرار ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمان کو فی الحال

* لیٹرز ٹو جناح

مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑیگا مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا مفاد اسی طریقۂ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ اسی لئے لیگ کا آئندہ اجلاس مسلم اقلیت کے کسی صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا*

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں بھی تقسیم ملک پر زور دیا ہے۔ یعنی صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال مسٹر جناح کو پاکستان کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ ۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں:

> میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیئے جو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا*

۱۱ اگست کو پھر لکھا: واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہو کہ لیگ کو اپنی تمام تر مساعی کو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مرتکز کر دینا چاہیئے۔ اور

> میں مکرر درخواست کرتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر میں لاہور میں منعقد کیا جائے۔ پنجاب میں لیگ کے لئے روز افزوں سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مجھے شبہ نہیں کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام کو لیگ سے مربوط کرنے کا اہم ذریعہ ثابت ہوگا*

---

* ۔ اقبال لیٹرز ٹو جناح

اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم کی جائیں۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی پالیسی اکثریتی صوبوں سے علیحدہ ہونی چاہیے۔ فرقہ وار فیصلے کی شدید حمایت کی جائے تاکہ بعض شر پسند لوگ محض اپنے ہندو حامیوں کو خوش کرنے کے لیے ملت کے مفاد کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کانگرس نے "رابطہ مسلم عوام" کی جو تحریک جاری کر رکھی ہے، اس کا جواب دینے کے لیے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانا اور مسلمان کے معاشی مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے۔ ان تمام مسائل کے متعلق علامہؒ نے جناح کو توجہ دلائی۔

جیل جانے کو تیار

۷ اکتوبر کے خط میں مسئلہ فلسطین پر ایک خط لکھا جس میں بتایا گیا کہ رابطہ عوام کا ایک نادر موقع ہے فلسطین کے مسئلے پر لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر کے کوئی ایسی راہ تجویز کیجیے جس میں عوام بہت بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ علاوہ بریں فرماتے ہیں:۔

> ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے ایک خطرہ ہے۔ (لیٹرز)

یہ تمام اقتباسات ان خطوط سے ماخوذ ہیں، جو علامہ اقبالؒ نے مسٹر جناح کو لکھے اور جو اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ قائدِ اعظم بھی علامہ کی اس رہنمائی کے بجد معترف اور مداح تھے۔ چنانچہ انہی خطوط کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

قائدِ اعظم اور اقبالؒ

جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام سے لیکر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کے اجلاس لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہند کی تاریخ کا ایک پُر از واقعات زمانہ ہے۔ اگر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے کی ایک عظیم کوشش تھی، تو مسلم لیگ کا اجلاسِ لکھنؤ کو عوامی بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانانِ ہند کا واحد نمائندہ ادارہ بنانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

یہ دونوں مقاصد اس وقت حل ہوئے جب مجھے سر محمد اقبالؒ اور انہی جیسے مخلص دوستوں کی مخلصانہ کوششوں اور بیغرض سرگرمیوں کی بدولت نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی*۔

عوام بالکل بے خبر تھے کہ علامہؒ اس وقت بستر ہی پر پڑے پڑے اسلامی ہند کی کس قدر مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، لیکن جاننے والے جانتے تھے۔ خود مسٹر جناح ارشاد فرماتے ہیں :-

مسلم لیگ کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا، سر محمد اقبالؒ نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس وقت نہ آسکا تھا۔

---

* دیباچہ لیٹرز ٹو جناح۔

یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ

علامہ اقبالؒ کو یونینسٹ پارٹی سے سخت اختلاف تھا بنائے اختلاف یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی ہندو، مسلم، سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی اور اس کی وجہ سے شہری دیہاتی حلقے الگ الگ ہو گئے تھے لیکن علاوہ اس طرزِ سیاست کے افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اور شہری و دیہاتی کی تفریق کے خلاف نہایت زوردار تقریر کی اور نجی محفلوں میں بھی ہر قسم اور ہر درجے اور ہر عقیدے کے مسلمانوں کو یونینسٹ پارٹی کی مضرتوں کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں میاں فضل حسین کا انتقال ہو گیا۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے قدم نہایت مضبوط و مستحکم تھے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں پونے دو سو نشستوں میں سے صرف چھ سات نشستوں کے لئے مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے جن میں سے صرف دو یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں کامیاب ہوئے۔ راجہ صاحب تو دوسرے دن ہی یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو کر پارلیمنٹری سیکرٹری بن گئے اور ملک برکت علی پوری اسمبلی میں تن تنہا مسلم لیگی باقی رہ گئے۔

لیکن ایک طرف تو سب کے سب یونینسٹ اپنے آپ کو بڑے زور شور سے قدیم مسلم لیگی کہتے تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بھی عوام میں

روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس لیے ہر حلقے سے کوشش جاری تھی کہ لیگ اور یونینیسٹ پارٹی کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے۔ چنانچہ احمد یار خاں دولتانہ نے ۲۴ جون ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی طرف سے مفاہمت کا یہ فارمولا پیش کیا۔ کہ

ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک آل انڈیا اقلیت کے متعلق ہیں وہ لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم پارٹی کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔

بشرطیکہ صوبائی مسلم لیگ بھی یہ اعلان کرے کہ وہ مسلم ارکان اسمبلی جو لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں پہنچے ہیں، اس پارٹی سے موالات کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔*

چونکہ اگست ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح نے بنگال مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ اور مولوی فضل الحق کی پرجا پارٹی (غیر فرقہ وار) کے درمیان مفاہمت کرا دی تھی۔ اس لیے علامہ اقبالؒ بیحد آرزومند تھے اور انھیں یقین تھا کہ مسٹر جناح کوشش کریں گے تو مسلم لیگ اور یونینیسٹ پارٹی کے درمیان بھی کوئی مصالحت کی راہ نکل آئے گی لیکن ان کی یہ امید اور سعی کامیاب نہ ہوئی۔

لکھنؤ میں لیگ کا اجلاس

۱۹۳۷ء میں کانگرس کی وزارتیں چھ صوبوں میں قائم ہو گئیں۔ ان صوبوں کے مسلمانوں کو سخت شکایات پیدا ہوئیں۔ پھر کانگرس رابطہ عامہ مسلمین کے

---

* سیاسی کارنامہ

سلسلے میں بھی بعض بے اعتدالیاں کر رہی تھی۔ لہذا مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ کمال کو پہنچ گئی۔ اکتوبر ۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جس میں تمام وہ مسلم جماعتیں بھی جو مسلم لیگ کے انضباط سے باہر تھیں، شامل ہوئیں۔ لاہور سے سر سکندر حیات خاں اور کلکتہ سے مولوی فضل الحق وہاں پہنچ گئے۔ اور مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم محمد علی جناح کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ گیا۔

میثاق جناح و سکندر یہاں سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان ایک میثاق قرار پایا جس کے متعلق سر سکندر نے بر سر اجلاس ایک بیان پڑھ کر سنایا، خلاصہ ملاحظہ ہو:

(۱) سر سکندر اپنی پارٹی کے تمام مسلم ممبروں کو جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں، مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے مسلک پر دستخط کر دیں۔ اس کے بعد وہ ان تمام قواعد و ضوابط کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوں گے، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ نے نافذ کر رکھے ہیں۔ مگر اس سے موجودہ یونینسٹ پارٹی کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

(۲) اس میثاق کے بعد آئندہ تمام انتخابات اور ضمنی انتخابات جو اسمبلی کے لئے ہوں گے، ان میں تمام گروپ اس شخص کی متحدہ مدد کریں گے جس کو پارٹی نے کھڑا کیا ہو۔

(۳) اسمبلی کے جو مسلم ممبر لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہوں۔ یا جنھوں نے لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کر کے اس میں شمولیت کی ہو۔ ان کی اسمبلی میں ایک علیحدہ پارٹی ہو گی جو مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی کہ وہ کسی دوسری پارٹی سے مل کر کام کرنا چاہے تو کر سکے۔ بشرطیکہ اس پارٹی کا پروگرام اور اصول لیگ سے مختلف نہ ہوں!

لکھنؤ سے واپس آکر کشمکش جاری

سر سکندر نے اخباروں میں یہ بیان شائع کیا:۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، سابقہ صورتحال ہنوز قائم و بحال ہے۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینیسٹ پارٹی کے ان مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں مشورہ دیا جائیگا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم ارکان لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے انھیں یہ عہد کرنا ہو گا کہ کامیابی پر یونینیسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے عوض انتخابی جنگ میں انھیں یونینیسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہو گی![۱]

اس پر علامہ اقبالؒ بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے: سر سکندر کے اس بیان کا مطلب تو یہ ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں بلکہ

۱۔ سیاسیات ملیہ۔ محمد امین زبیری ۳۲۳/۳۲۲ ۲۔ "امروز" کراچی اقبال نمبر ۱۹۵۰ء

وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ ہے۔ آپ کے اشارے سے غلام رسول خاں سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان شائع کر کے سر سکندر کو جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی ممبری کے نوے فارم سر سکندر کی خدمت میں بھیج کر لکھا کہ آپ نے اس میثاق میں یہ ذمہ لیا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی مسلم ارکان کو لیگ کا ممبر بن جانے کا مشورہ دیں گے۔ لہٰذا اب ان سب سے ان فارموں پر دستخط کرا دیجئے۔ لیکن یہ فارم دستخط شدہ واپس نہ آئے۔ اس پر علامہؒ نے پھر مسٹر جناح کو خط لکھا جس میں سر سکندر اور ان کے رفیقوں کی شکایت کی۔

یہ جھگڑا سر سکندر اور علامہ اقبالؒ کے درمیان جاری رہا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سر سکندر نے اپنے چند رفقاء کو ساتھ لے کر علامہؒ سے ملاقات کی اور "سکندر جناح پیکٹ" کے منشا اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق گفتگو ہوئی۔ سر سکندر چاہتے تھے کہ مسلم لیگ پر یونینسٹ پارٹی کو جو حکمران پارٹی تھی، برتری حاصل رہے۔ اور علامہؒ کا منشا یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کو ہرگز یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے عملاً ختم کر دے۔ آخر علامہ اقبالؒ نے فیصلہ کر لیا کہ اس میثاق ہی کو ختم کر دیا جائے تاکہ یونینسٹ پارٹی کا سیاسیات میں کوئی دخل ہی باقی نہ رہے اور لیگ ایک آزاد و زندہ قومی ادارہ بن جائے۔

شہید گنج مسجد شہید گنج کا انہدام، حکومت کا تشدد، مسجد کی بازیابی کی لئے سول نافرمانی اور اس کے بعد عدالتِ عالیہ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف صادر ہونا، علامہ اقبالؒ کے لئے نہایت قلق کا باعث تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسجد کی بازیابی کے لئے تمام مسلمانانِ ہند مل کر کوشش کریں اور آل انڈیا

مسلم لیگ اس معاملہ میں ان کی رہنمائی کرے۔ بلکہ ایک روز انھوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کرے گی تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کر دوں گا* اس دوران میں علامہؒ نے ملک برکت علی کو مساجد و معابد کی حفاظت اور بالخصوص شہید گنج کی واپسی کے لیے ایک مسودہ قانون تیار کرنے کا حکم دیا چنانچہ مسودہ تیار ہوا اور اس کو پنجاب اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس بھی دیدیا گیا۔ دوسری طرف علامہؒ آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اپنا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کرے۔ لیکن ان دونوں باتوں میں علامہؒ کو ناکامی ہوئی اس لیے کہ سر سکندر حیات خان حتی الوسع صوبے کو فرقہ وار کشیدگی کے مزید مظاہرے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ ملک برکت علی کا بل فی الحال التوا میں ڈالدیا گیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان کو سر سکندر نے اس امر کا قائل کر لیا کہ موجودہ فضا میں لیگ کا جلسہ لاہور میں نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہائی کمان نے مقامِ اجلاس کلکتہ کو قرار دیا۔ جہاں شہید گنج کی کوئی گونج تک نہ سنائی دے۔

یونینسٹ پارٹی

اس میں شک نہیں کہ یونینسٹ پارٹی جس کو میاں سر فضل حسین نے ۱۹۱۹ء میں قائم کیا تھا اور جس کے سردار میاں صاحب کے انتقال کے بعد سر سکندر حیات تھے، پنجاب کی بہترین سیاسی پارٹی تھی جس میں زراعت پیشہ مسلمان، زراعت پیشہ ہندو، زراعت پیشہ سکھ اور دوسرے حضرات بھی شامل تھے اور پارٹی کی تنظیم خالص اقتصادی

* امروز کا اقبال نمبر، ۱۹۵۰ء

بنیاد پر کی گئی تھی۔ اس پارٹی کا مدمقابل شہری ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ تھا۔ چونکہ پنجاب میں زراعت پیشہ آبادی کی اکثریت مسلمان تھی۔ اس لئے پارٹی جو بھی کارہائے فلاح انجام دیتی تھی، ان کا سب سے زیادہ فائدہ مسلمانوں کو حاصل ہوتا تھا اور غیر مسلم زراعت پیشہ طبقوں کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ اس پارٹی نے سر سکندر کی رہنمائی میں جنگ یورپ دوم سے قبل متعدد ایسے قوانین نافذ کرائے جن سے پنجاب میں ساہوکارہ نابود ہو گیا۔ مدت دراز کی مرہونہ زمینیں واگذار ہو گئیں۔ دیہاتی قرضے کا قلع قمع ہو گیا۔ اگر جنگ عظیم درمیان میں حائل نہ ہو گئی ہوتی تو خدا جانے یونینسٹ پارٹی کے ہاتھوں چند ہی سال کے اندر صوبے کی معاشی و اقتصادی حالت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہوتا۔

علامہ اقبالؒ بھی پارٹی کے ان کارناموں کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے اور اکثر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان مفاہمت کے لئے انتہائی اضطراب ظاہر کیا کرتے تھے، لیکن چونکہ اصول کا معاملہ تھا، اس لئے وہ آخر تک اپنے آپ کو یونینسٹ پارٹی کی پالیسی سے راضی نہ کر سکے کیونکہ یہ پارٹی غیر فرقہ وار تھی۔ اور اقبالؒ کا نصب العین مسلمانوں کی مستقل حیاتِ ملی کی تنظیم تھا۔

آخری بیان

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ اس سلسلے میں جو آخری تحریر علامہ اقبالؒ کے قلم سے صادر ہوئی اور جس میں انھوں نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف شکایات یکجا کر کے یہ تجویز کی تھی کہ میثاق کو کالعدم سمجھا جائے، وہ ایک بیان تھا جو انھوں نے غلام رسول خاں بیرسٹر

سیکرٹری صوبہ مسلم لیگ سے ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو یعنی موت سے ۷ دن پہلے لکھوایا۔ یہ بیان مسٹر جناح کو بھیجا گیا تو انھوں نے بذریعۂ تار خواہش کی کہ اس کی اشاعت ملتوی کر دی جائے۔ چنانچہ یہ بیان کسی اخبار کو بھی نہیں دیا جا سکا۔*

یہ چیز علامہؒ کے لئے بہت مایوس کن تھی اور دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے پنجاب مسلم لیگ کو یہ اطلاع دی گئی کہ اس کا الحاق آل انڈیا لیگ سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور اپنے بستر مرگ ہی پر پڑے پڑے مسلم لیگیوں کا وفد مرتب کر کے کلکتہ بھیجا تاکہ ہائی کمان کو پنجاب کے حالات سے مطلع کرے اور یونینسٹوں کے دام فریب میں نہ پھنسنے دے۔

یہ وفد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ سے لاہور روانہ ہوا۔ اسی دن علامہ اقبالؒ رہگزائے عالم جاودانی ہوئے۔ یعنی آخری دم تک اسلام کا یہ شہسوار اشہب عمل کی پشت سے نہیں اترا، اور خانۂ زین ہی میں شہادت کی نعمت سے سرفراز ہوا۔

اقبالؒ اور احمدیت

۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا۔ صوبے کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے عالی شان جلسے منعقد ہوئے جلوس نکالے گئے۔ اخباروں نے بالخصوص "زمیندار" نے اپنے صفحوں کے صفحے

* "امروز" کا اقبال نمبر ۱۹۵۰ء و اقبال کا سیاسی کارنامہ" ۲۳۵/۲۳۳

احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دیئے۔ عامۃ المسلمین کا قول یہ تھا کہ حضور سرورِ کائنات صلعم کے بعد مدعی نبوت کافرِ مطلق ہے اور جو لوگ حضور صلعم کے بعد کسی کو نبی مانتے ہیں وہ گویا رسالتِ محمدیہ صلعم کے منکر ہیں۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرست رائے دہندگان سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ہندوؤں، اچھوتوں اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔

خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدتمند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کئے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقہ کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کر لے۔ "سن رائز" اور "لائٹ" انگریزی کے دو ہفتہ وار پرچے احمدیوں کے زیرِ ادارت نکلتے تھے۔ انھوں نے کچھ لکھا تو علامہؒ نے ان کا بھی جواب دیا۔ پھر "سٹیٹسمین" (۱۰ جون ۱۹۳۵ء) میں اسی مسئلے کے متعلق ایک مفصل جوابی مضمون لکھا۔

جواہر لال نہرو سے بحث

اس پر خدا جانے پنڈت جواہر لال نہرو کو کیا سوجھی انھوں نے "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں تین مضامین "مسلمان اور احمدیت" کے موضوع پر گھسیٹ ڈالے اور علامہ اقبالؒ نے اس کے جواب میں ایک جامع مانع مضمون لکھا جس میں اس مسئلے کا فلسفیانہ تجزیہ کر کے نہایت فاضلانہ انداز میں پنڈت نہرو کے ایک ایک فقرے کا جواب دیا۔ اس کے بعد پنڈت جی خاموش ہو گئے*۔ ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ

* احمدیت کے متعلق تمام تحریروں کے لیے دیکھو "خطبات و تقاریرِ اقبال" صفحہ ۱۱۹ سے۔

علامہ اقبال رح نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت، امام جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ رح نے بعض ایسے نکات پیش کئے ہیں جن کا جواب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔

تصنیفی منصوبے

علامہ اقبال رح کے ہم صحبت نیاز مندوں کو معلوم ہے کہ حضرت ممدوح کے ذہن میں بعض نہایت مفید تصنیفات کے خاکے اور بعض تنظیمی و اصلاحی اداروں کے منصوبے موجود تھے۔ جن کو وہ اپنی زندگی میں معرض شہود میں نہ لا سکے۔ لیکن ان کی تڑپ علامہ رح کے قلب میں مرتے دم تک رہی مثلاً

وہ جوانی ہی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرح اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آجکل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا (Construction of Islamic Jurisprudence) انھوں نے بارہا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے جس کا نام ہوگا Islam As I Understand It (یعنی اسلام میرے نقطۂ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنسدان اور فلسفی کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسا

زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانۂ حال کے علمی حلقے سمجھتے ہیں۔

اواخرِ حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعہ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں، وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the Study of Quran بتایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ یہ ارادہ ہوا تھا کہ جس طرح نیٹشے نے Thus Spake Zara. thustra زرتشت نے یوں کہا، لکھ کر بعض حقائق کو نہایت دلاویز پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح علامہؒ بھی ایک کتاب لکھیں گے۔ The Book of an Unknown Prophet ایک گمنام نبی کی کتاب"۔ منشا یہ تھا کہ بعض مابعد الطبیعی اور طبیعی حقائق و معارف بائبل کے طرز پر لکھے جائیں۔ علامہؒ اس کے لیے نثر کا ادبی اسلوب سوچ رہے تھے۔

ایک علمی اسلامی ادارہ مدت دراز سے علامہؒ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہر جمع کیے جائیں اور ان ماہرین کو خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے۔ تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہؒ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلامی اور شرح اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو آج کل کی دنیا کے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں چنانچہ ایک دفعہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انھوں نے ریاست

بھاول پور میں سرکار بھاول پور کے زیر سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سروسامان درست کیا لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا۔

آخر ۱۹۳۷ء میں ایک دیندار، مخلص، صاحب ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خاں علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ پٹھان کوٹ (ضلع گورداس پور) کے رہنے والے تھے اور پٹھان کوٹ سے کوئی ایک دو میل دور ان کی زرعی اراضی موجود تھی۔ چودھری صاحب نے علامہؒ کی خدمت میں گزارش کی کہ میں نے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی آپ کے مجوزہ ادارے (دارالسلام) کے لئے وقف کر دیا ہے، تاکہ اس پر کتب خانہ دارالمطالعہ، مکانات برائے مصنفین اور دوسرے ضروری مساکن تعمیر کر دیئے جائیں۔ جتنے علما و مصنفین اس ادارے میں رہ کر علوم اسلامی کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کریں گے، میری جائداد زرعی کی آمدنی ان سب کی معاش کی کفیل ہو گی۔ وہ ہر طرف سے بے فکر ہو کر امن و سکون کی فضا میں اپنا کام انجام دے سکیں گے۔ حضرت علامہؒ چودھری نیاز علی خان کی اس روشن خیالی اور دین پروری سے بیحد خوش ہوئے۔ اور انھیں "دارالسلام" میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آگئی۔

شیخ ازہر کے نام خط

اس موقع پر علامہؒ نے علامہ مصطفیٰ مراغی شیخ جامعہ ازہر کو ایک خط لکھا:

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم

کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی و اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت میں وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہاسٹل بنانا چاہتے ہیں جو ان کے لئے ایک علمی مرکز ہو اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتابیں موجود ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل اور صالح ہو اور قرآن کریم میں بصیرت تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلاب دور حاضر سے بھی واقف ہو تاکہ وہ ان کو کتاب اور سنت رسول اللہ صلعم کی روح واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریر کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔
اس تجویز کی اہمیت آپ پر منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں لہذا میری تمنا ہے

کہ آپ ازراہِ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں۔*

(اصل خط عربی میں لکھا گیا تھا)

یہی وہ دارالسلام ہے جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقا سکونت گزیں ہو گئے تھے اور وہیں سے رسالہ "ترجمان القرآن" شائع ہونے لگا تھا لیکن تقسیم کے بعد نہ وہ پٹھان کوٹ رہا، نہ وہ دارالسلام، نہ چودھری نیاز علی خاں۔ رہے نام اللہ کا!

لاہور میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ علامہ اقبالؒ کی اسی خواہش کو عملی صورت دینے کے لئے قائم ہے جس میں علومِ جدیدہ و قدیمہ کے ماہرین دین اسلام اور ثقافتِ اسلامی کی خدمت میں مصروف ہیں اور ادارہ اپنے وسائل کے مطابق علامہ کے منشا کی تعمیل کر رہا ہے۔ وسائل میں اضافہ ہونے سے اس کے علمی و ثقافتی کارناموں میں بھی گراں قدر اضافہ ہونے کی توقعات ہیں۔

۱۹۳۷ء میں علامہؒ کی آنکھ میں موتیا اس قدر اتر آیا کہ لکھنا پڑھنا بالکل ہی ممنوع ہو گیا۔ میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) علی العموم علامہؒ کی صحبت میں رہتے تھے وہی اخبارات پڑھ کر سناتے تھے اور وہی خطوط کے جواب لکھ دیا کرتے تھے۔ میاں صاحب نے علامہؒ کے اواخر ایام میں جس خلوص سے ان کی خدمت کی وہ عدیم المثال ہے۔

مسعود کا انتقال دوست قدیم نواب ذوالفقار علی خاں اور ہمدم و دمساز رفیقۂ حیات (والدہ جاوید) کی موت سے علامہ کو

---

* مکاتیب اقبال اول ۲۵۲/۲۵۱

اس عالم ضعف و علالت میں بعید روحانی صدمہ پہنچا لیکن ابھی ایک اور جانکاہ حادثہ باقی تھا۔ سر راس مسعود جن سے علامہؒ کے قلبی و روحانی تعلقات تھے اور جنھوں نے علامہ کی خاطرداری اور خدمت و تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اواخر جولائی ۱۹۳۷ء میں دفعتاً انتقال کر گئے۔ علامہؒ نے یکم اگست ۱۹۳۷ء کو لیڈی مسعود کے نام تعزیت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے وفور اضطراب نمایاں ہے۔ اس موقع پر مسعود کے مرثیہ کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگار کمالات احمد و محمود

زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اسکی
وہ کارواں کا متاع گران بہا مسعود

مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیدردی
فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" سعدی

علی گڑھ نے تو کئی سال پہلے علامہؒ کو ڈاکٹریٹ پیش کر دی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کی تقریب میں علامہؒ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور علامہؒ کو الہ آباد تک تکلیف فرمانے کی زحمت بھی نہ دی۔

انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے علامہؒ نے استعفا دے دیا کیونکہ مسلسل علالت کی وجہ سے کام نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی جگہ خان بہادر نواب مظفر علی خاں صدر منتخب ہوئے۔

بچوں کی تربیت

۱۹۲۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اہلیہ کی بہن جو جرمن خاتون ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے بھی واقف تھی اور اردو بھی بول لیتی تھی، جاوید اور منیرہ کی گورنس مقرر کی گئی۔ اس وقت جاوید کی عمر تقریباً تیرہ سال اور منیرہ کی تقریباً سات سال ہو گی۔ یہ خاتون علامہ کو انتظام خانہ داری اور تربیت اطفال میں بے حد خوش سلیقہ اور منتظم ثابت ہوئیں۔*

اسی سال علامہ نے منشی طاہر الدین، چودھری محمد حسین، میاں امیر الدین اور اپنے بھتیجے شیخ اعجاز کو اپنے بچوں کا سرپرست قانونی مقرر کیا۔ اس سے پیشتر ۱۹۲۵ء کی وصیت کے مطابق میاں امیر الدین کی جگہ جاوید کے ماموں خواجہ عبد الغنی مقرر کئے گئے تھے لیکن ان کا انتقال ہو گیا تو میاں امیر الدین (بارود خانہ) مقرر کیے گئے۔* اب چودھری محمد حسین اور منشی طاہر الدین بھی انتقال کر چکے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی

۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ "اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" اس کی تفصیل یو۔پی کے بعض اخباروں میں شائع ہوئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریہ وطنیت کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ علامہ اقبالؒ عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف جہاد کرتے رہے، اس لیے انھیں مولانا حسین احمد کے فقرے سے بے حد صدمہ ہوا اور انھوں نے وہ تین اشعار لکھ دیے جو زبان زد عام ہیں۔ لیکن اس کے بعد

---

* مکاتیب اقبال اول ۳۸۶-۳۸۵۔

جب مولانا حسین احمد نے ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کر دیا تو علامہؒ نے بھی اس ضرر کی تلافی کر دی جو ان کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو آپ نے لکھا:۔

مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت کے اختیار کرنیکا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنیکا نہیں رہتا۔
میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں۔ جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں*

---

* روزنامہ احسان ۲۸ مارچ ۳۸ء

تیسرا باب

مرضِ الموت اور انتقال

مسلمانوں کی سیاسیات سے حضرت علامہ کے شغف کا حال تو معلوم ہو چکا کہ وہ آخری دم تک اپنے نظریات کے مطابق خدمت میں مصروف رہے۔ فکر شعر کی کیفیت یہ تھی کہ آخری ایک دو سال "ارمغان حجاز" کی ترتیب میں بسر ہوئے اور چودھری محمد حسین اور سید نذیر نیازی مختلف نظموں اور رباعیوں کو حضرت کی صوابدید کے مطابق مرتب کرتے رہے۔ آپ حجاز جانیکا عزم مصمم کر چکے تھے اور اس سفر کے لئے بعض جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت بھی ہو چکی تھی بلکہ ایک دن راقم الحروف کو بتایا کہ جب مسولینی کو میرے عزم حجاز کا علم ہوا تو اس نے اپنے کارکنوں کو حکم دیدیا کہ اقبال جب بحیرۂ احمر میں داخل ہوں تو بندرگاہ مصوع پر انہیں اطالیہ کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا جائے۔ ارمغان حجاز کی متعدد

نظموں اور رباعیوں سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اپنے تصور میں حجاز کا سفر کر رہے تھے کہ اصلی سفرنامہ حجاز تو وہ ہوگا جو حجاز سے واپسی پر لکھا جائیگا۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ * اس سلسلے میں آخری اردو نظم جو کہی گئی، اس کی تاریخ ۷ فروری ۱۹۳۸ء ہے۔ یہ چھ شعر کا ایک مختصر قطعہ ہے جس کا موضوع ہے "حضرت انسان"

اگرچہ علامہ کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے جاری تھا لیکن جب ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا اور آل انڈیا پیمانے پر پہلا یوم اقبال نہایت کامیابی سے منایا جا چکا تو علامہ کی علالت نے یک بیک نیا پلٹا کھایا۔ اس زمانے میں حکیم محمد حسین قرشی ان کا علاج کر رہے تھے۔ علامہ کو ضیق النفس کے خفیف دورے شروع ہوئے پچھلی رات بے خوابی ہونے لگی۔ دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی ضیق النفس کے لئے حکیم قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعف قلب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی اس تشخیص کی تائید کی۔ ان دنوں ہم نے اکثر دیکھا کہ علامہ بستر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر اپنا سر ٹیک دیتے ۲۵ فروری کو دمہ کا دورہ ہوا۔ جوشاندہ پیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ پھر ایلوپیتھک علاج شروع ہوا جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی۔ چند روز ذرا آرام سے گزر گئے، ۳ مارچ کی شب کا ذکر ہے۔ علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی۔ اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے۔ دوسرے دن حکیم قرشی صاحب نے ان کو دیکھا تو ان کے نیازمندوں کو بتا دیا کہ علامہ کا قلب

* اقبال کا مطالعہ سید نذیر نیازی ۱۳۹

نہایت ضعیف ہے۔ جگر اور گردے بھی ماؤف ہو چکے ہیں۔ مگر اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا۔

اس حالت کے پیشِ نظر معالجین اور عقیدت مندوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وقتِ آخر قریب ہے۔ لیکن علامہ کی ذہنی و فکری مستعدی کو دیکھ کر یہ یقین متزلزل ہو جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بدستور اپنے ہم نشینوں اور ملاقاتیوں سے سیاسیاتِ یورپ، اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور دوسرے موضوعات پر گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ حکیم محمد حسین قرشی طبیب کی حیثیت سے نہیں، بلکہ انتہائی مخلص عقیدت مند کی حیثیت سے حضرت علامہ کے علاج میں مصروف تھے۔ گھنٹوں بلکہ بعض اوقات رات کے ایک ایک بجے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ خوش گوار دوائیں کھلاتے، خوش گوار باتیں کرتے اور علامہ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔

ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی کبھی کبھی مشورہ کر لیا جاتا اور وہ بھی انتہائی عقیدت اور توجہ سے علاج کرتے لیکن علامہ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی و ناگواری سے بے حد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا۔ معالج سب کے سب متفق تھے کہ علامہ کو عظم و اتساعِ قلب کا عارضہ ہے۔ چونکہ قلب ضعف کی وجہ سے اپنے وظائف پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ اس لئے دمہ عارض ہے۔ گردوں کی کیفیت دیکھ کر حکیم قرشی صاحب کا خیال تھا کہ استسقا کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو نفرت ہوتی تھی لیکن جب انھیں خمیرہ گاؤزبان عنبری یا دوا المسک اور اوراق نقرہ میں رکھ کر دی جاتی تو بے حد خوش ہوتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ثابت ہیں۔ آج کل دواؤں کا کیا ہے۔ ادھر ایجاد

ہوئیں ادھر متروک۔

۱۷ مارچ سے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ خبر گیری اور تیمارداری کا تسلسل ضروری تھا۔ چنانچہ میاں محمد شفیع تو مستقل طور پر جاوید منزل ہی میں اٹھ آئے تھے اور رات بھر جاگ کر علامہ کو دوائیں کھلایا کرتے تھے۔ آدھی رات تک چودھری محمد حسین، راجہ حسن اختر، حکیم قرشی صاحب بیٹھے ہوئے علامہ کا دل بہلاتے رہتے۔ حضرت علامہ کو اپنے احباب کے جذبۂ خدمت گزاری کا متشکرانہ احساس تھا اور وہ خلوت میں اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے۔ ایک شام جب علامہ انتہائی درد و کرب کی حالت میں تھے، علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کیا۔ نیازمندوں نے اس کو تسلی دی تو فرمایا: "رونے دیجئے تیس بتیس برس کا ساتھ ہے، جی ہلکا ہو جائیگا۔"

انتقال سے دو ایک روز پہلے احباب سے مختلف مسائل پر بات چیت کر رہے تھے کہ یہ رباعی لکھوائی۔

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست　　بہشتے بہر پاکان حرم ہست
بگو ہندی مسلماں کہ را خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

ان دنوں بھی مسلمانانِ عالم کے حالات، اسلامی ملکوں کے واقعات۔ وطنیت پرستی کی لعنت، مسلمانوں کے ذہنی و اخلاقی انحطاط پر نہایت دردمندی سے اظہارِ تاسف فرماتے اور اکثر رونے لگتے۔ ایک دن مرضِ قلب کے متعلق ذکر چلا تو یہ شعر پڑھا:

تہنیت گو بیاد مناں راکہ سنگ محتسب　　بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

اس شعر کے پڑھنے کے بعد سخت رقت طاری ہوئی یہاں تک کہ ہم نشین

مضطرب ہو گئے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق اس حد تک تھا کہ ذکرِ مبارک کے ساتھ ہی اشکبار ہو جاتے۔ اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ حضور کا اسمِ گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور حالتِ بدنی میں کوئی خرابی تو نہیں۔

مرض الموت کی یہ کیفیت تھی کہ آخر میں استسقار ہوا چہرے، پاؤں پر ورم ہو گیا۔ دردِ پشت اور دردِ شانہ کے عوارض شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے دیکھا تو مایوسی ظاہر کی۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے حرفِ تسلی کہنے کی کوشش کی تو علامہؒ نے فرمایا: "میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا":

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　　چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامہ دردِ پشت کی وجہ سے بہت بے چین تھے کہ اتنے میں ان کے ایک پرانے ہم جماعت (جو ہائیڈل برگ جرمنی میں ان کے ہم سبق تھے) بیرن فان فلٹ ہائم اتفاق سے ملاقات کو آنکلے۔ ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا۔ علامہ نے ان سے خوب جی بھر کے باتیں کیں اور طالب علمی کے زمانے کی باتیں بڑے لطف سے کرتے رہے۔ یہ صاحب آخری بیرونی ملاقاتی تھے جو علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ وہ چلے گئے تو بعض دوسرے لوگوں سے کانگرس اور لیگ کی باتیں ہوتی رہیں۔

۱۹ اپریل کی شام سے حضرت علامہ کو بلغم میں کسی قدر خون آرہا تھا اور یہ علامت سب کے نزدیک یاس انگیز تھی۔ ڈاکٹر امیر چند آگئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو

چند ہدایات دے کر چلے گئے۔ اس کے بعد علامہ کو خیال آیا کہ حکیم قرشی صاحب شام سے بھوکے بیٹھے ہیں۔ کھانا نہیں کھایا۔ آپ نے علی بخش سے کہا کہ حکیم صاحب کو بسکٹ کھلاؤ اور چائے پلاؤ۔ چودھری محمد حسین، حکیم قرشی صاحب، سید سلامت اللہ شاہ اور سید نذیر نیازی خدمت میں حاضر تھے۔ راجہ حسن اختر کے متعلق دریافت فرمایا تو بتایا گیا کہ وہ ایک کام سے گئے ہیں۔ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آئے۔ مگر اس کے پینے ہی علامہ کا جی متلانے لگا۔ اس پر حکیم صاحب نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک دی جس سے طبیعت بحال ہو گئی۔

جب ان ہم نشین حضرات نے دیکھا کہ علامہؒ مائل خواب ہیں تو انھوں نے اجازت طلب کی اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

راجہ حسن اختر اس وقت جاوید منزل پہنچ گئے تھے۔ علامہ کچھ دیر سوتے رہے پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی اور فرمایا: قرشی صاحب کو بلاؤ۔ راجہ صاحب نے کہا وہ ایک بجے یہاں سے گئے ہیں۔ شاید ان کو بیدار کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اس پر فرمایا: کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو انھوں نے گزشتہ دسمبر میں پڑھی تھی:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ۔۔۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے ۔۔۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب یہ سن کر حکیم صاحب کو بلانے کے لیے چلے گئے۔ یہ واقعہ پانچ بج کر پانچ منٹ کا ہے۔ حضرت علامہ خواب گاہ میں آ گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ہدایت فروٹ سالٹ تیار کیا۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا اتنا بڑا گلاس کیونکر پیوں گا؟ اور پھر

چپ چاپ سارا پی گئے۔ علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی۔ اس وقت علی بخش کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ علامہؒ نے اس سے فرمایا: میرے شانوں کو دباؤ۔ پھر لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا لیے۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا: "یا اللہ! یہاں درد ہے۔" اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ علی بخش نے بڑھ کر سہارا دیا تو سوا پانچ بجے صبح حضرت حکیم الامت نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو و حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل من علیہا فان۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام*

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے عیسوی حساب سے پینسٹھ سال ایک مہینہ انتیس دن اور ہجری حساب سے سڑسٹھ سال ایک مہینہ چھبیس دن کی عمر پائی۔

حضرت علامہؒ کے انتقال کی خبر چند لمحوں کے اندر شہر میں پھیل گئی۔ اخبارو‌ں نے ضمیمے شائع کیے۔ تمام سرکاری دفاتر۔ عدالتیں۔ کالج اسکول۔ اسلامی ادارے بند کر دیے گئے اور شہر کے ہر گوشے سے علامہؒ کے عقیدت مندوں نے انبوہ در انبوہ جاوید منزل کا رخ کیا تاکہ اس درویش خود آگاہ و خدا آگاہ کی آخری زیارت سے مشرف ہو سکیں۔ علامہؒ کے احباب۔ نیاز مند اور خدام کی حالت وفورِ غم سے ناقابلِ بیان ہو رہی تھی۔ علی بخش پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ جاوید اور منیرہ خاموش اور سہمے ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابا جان کو کیا ہو گیا۔ جاوید منزل اس بیوہ کی طرح نظر آ رہی تھی جس کا سہاگ اجڑ گیا ہو۔ صدہا مشتاقانِ زیارت

* علامہ کے مرض الموت کے حالات کے لیے میں نے زیادہ تر سید نذیر نیازی کے بیان پر تکیہ کیا ہے۔

قطار در قطار حضرت علامہ کا چہرہ دیکھ دیکھ کر گزرتے جاتے تھے اور حضرت کے چہرے پر سکون واطمینان کے علاوہ ہلکا سا تبسم بھی تھا۔

"چو مرگ آید تبسم برلب اوست"

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حضرت علامہ کا مدفن کہاں ہو؟ کوئی ایسا مقام ہونا چاہیے جو دوسرے قبرستانوں سے نمایاں اور ممتاز ہو، کیونکہ یہ مدفن صدیوں تک "سجدۂ صاحب نظراں" کا مورد رہنے والا ہے۔ چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے خیال ظاہر کیا کہ حضرت کو شاہی مسجد لاہور کے کسی حجرے میں دفن کیا جائے۔ اس کے لئے سرکاری اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ سردار سکندر حیات خاں کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آرہے تھے لیکن انتظار خارج از بحث تھا۔ بہرحال قرار یہ پایا کہ چند اشخاص شاہی مسجد جاکر مدفن کی تیاری کریں۔ چنانچہ چودھری محمد حسین۔ سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خاں۔ میاں نظام الدین۔ میاں امیرالدین۔ مولانا غلام مرشد، مولانا غلام رسول مہر اور سالک شاہی مسجد گئے اور دیکھ بھال اور بات چیت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ حجرہ مناسب جگہ نہیں۔ مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب جو قطعہ زمین خالی پڑا ہے وہ حضرت علامہؒ کے مدفن کے لئے موزوں رہے گا۔ اس کے بعد حصول اجازت کے لئے پانچ حضرات کا ایک وفد سر ہنری کریک گورنر پنجاب سے ملا۔ یہ مسئلہ محکمہ آثار قدیمہ سے متعلق تھا اور مرکزی حکومت کی منظوری دہلی سے منگوانا ضروری تھا۔ سر ہنری کریک نے انتہائی ہمدردی سے کام لے کر خود حکومت ہند سے بات چیت کر کے دو پہر تک اجازت منگا دی۔

شام کے پانچ بجے تک جاوید منزل پر ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہو گیا اور پنجاب بھر کے عمائد و اکابر نو بلا امتیاز مذہب و ملت جمع تھے۔ وزرائے حکومت عدالتِ عالیہ کے جج حکامِ اعلیٰ۔ وکلا، شعرا، ادبا۔ اخبار نویس۔ کالجوں کے پروفیسر، طلبہ، سجادہ نشین، علما، تجار، صناع اور عام فرزندانِ اسلام جنازے کے ساتھ باچشمِ گریاں آہستہ آہستہ جا رہے تھے اور رونے والوں کی آوازوں سے ہر طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیئے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کندھا دے سکیں۔ گورنر پنجاب اور نواب بھاولپور کی طرف سے ان کے سکرٹریوں نے پھولوں کی چادریں چڑھائیں جنازے کے جلوس کے آگے پیدل اور سوار پولیس، احرار کے سرخ پوش رضاکار۔ نیلی پوش والنیٹر، خاکساروں کا جیش کام ریڈ مسلم جیش۔ الہلال پارٹی، غرض متعدد جیوش اپنی اپنی وردیوں میں جنازے کے ہمراہ تھے۔ جاوید منزل سے یہ عظیم الشان جلوس ریلوے سٹیشن اور ریلوے روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کے وسیع سبزہ زار میں پہنچا جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کم و بیش بیس ہزار مسلمان جمع تھے۔ لیکن جب جنازہ برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے کی طرف چلا تو جنازے کے ساتھ کوئی پچاس ساٹھ ہزار مسلمان، ہندو اور سکھ ضرور ہوں گے۔ سات بجے کے بعد جلوس شاہی مسجد پہنچا۔ نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی بے پناہ کثرت کے باعث وضو اور ترتیب صفوف میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اور پونے دس بجے یہ عزیز و محبوب جسم سپردِ خاک کر دیا گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر جن اخباروں نے ماتمی نمبر نکالے، جن انجمنوں نے تعزیتی جلسے کیے، جن اکابرِ ہند اور اعاظم رجالِ عالم نے ماتم پرسی کے پیغامات بھیجے، جن شعرا نے مرثیے لکھے، جن اہلِ فکر نے قطعاتِ تاریخ تصنیف کیے ان کا ذکر ایک علیحدہ کتاب چاہتا ہے۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان تو ایک طرف دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ رہا جس کے اکابرِ سیاست اور اہلِ فضل و کمال نے اس نابغۂ عظیم کے حضور میں تحسین و عقیدت کا خراج پیش نہ کیا ہو اور ہمارے اخبار نویسوں اور شاعروں نے تو علامہ کے تذکرہ اور ان کے فلسفہ و شعر کے تبصرہ کا حق ادا کر دیا، بلکہ ابتک کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنے اس "دوست فلسفی اور رہنما" کے انتقال سے بیحد صدمہ ہوا۔ اور ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کی صدارت کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا کہ اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لیے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف "اقبال کی تصنیفات" ہیں۔ تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو، تو میں "اقبال کی تصانیف" کو ترجیح دوں گا۔

چوتھا باب

اقبالؒ کا اسلوبِ زندگی

علامہ اقبالؒ علومِ مغربیہ کے فاضل اجل، انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود مغرب زدگی سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، ان کا ذہن کامل مشرقی اور فکر قطعی اسلامی تھا۔ آج کل کے معمولی "ولایت پلٹ" لوگ جن کو علم و ثقافت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا، نہ صرف مغربی اسلوب زندگی اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ اس کالے آدمی سے بات کرنا بھی ہتک سمجھتے ہیں جو گوروں کے ملک میں کبھی نہیں گیا۔ لیکن اقبال اس اثر سے بالکل آزاد تھے۔ مغربی تعلیم اور جدید فلسفے کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اس کی مشرقی سادگی اور اسلامی ذہنیت وہی رہی جو اکابر مشرق کی کتابوں اور بزرگانِ اسلام کی نگاہوں

نے اس میں پیدا کر دی تھی۔

اقبالؒ کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں بھی چٹورپن سے انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ جب میں پہلے پہل لاہور آیا تو علی بخش میرے ساتھ تھا لیکن تھا بالکل جانگلو۔ اتفاق سے اس نے کہیں سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ صرف آلو گوشت ہی پکا کر میرے سامنے رکھ دیتا تھا۔ صبح آلو گوشت، شام آلو گوشت، یہاں تک کہ چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں احباب کی دعوتوں کے سوا میں نے مسلسل آلو گوشت ہی پر گذران کی اور علی بخش نے بھی کوئی اور سالن پکانا نہ سیکھا۔ بعد میں علی بخش بعض کھانے اچھی طرح پکانے لگا۔ لیکن اقبال اس کے آلو گوشت کو عمر بھر نہ بھول سکے۔ زندگی کے آخری سالوں میں علالتِ طبع کی وجہ سے اقبالؒ کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی، لیکن اس سے قبل بھی صبح کلچہ یا باقرخانی حلوے کے ساتھ کھا کر کشمیری چائے پی لیا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسی نوش فرماتے تھے۔ دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں، تیسرے پہر کچھ نہیں۔ رات کو پھر وہی سالن اور چپاتیاں، پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔ لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ Pan.Islamic dishes ہیں۔ چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ، پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے۔ دہی بھی بہت پسند تھا۔ دلیا دودھ ڈالکر اکثر کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی تیسرے پہر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلم بھنوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دستر خوان بڑھوا دیتے۔ کھانا کھانے کا عام انداز یہ تھا کہ علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو

تین ہلکی سی چپاتیاں رکھ کر لے آیا۔ اقبال بستر پر سیدھے ہو بیٹھے۔ علی بخش نے بستر ہی پر ایک رومال بچھا دیا اس پر سینی رکھ دی۔ علامہؒ نے پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو صلاے دی اور کھانا شروع کر دیا۔ علی بخش پانی لئے بیٹھا رہا۔ ایک آدھ چپاتی کھا کر علامہؒ نے فرمایا "اٹھاؤ"۔ علی بخش نے سینی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ چلمچی آفتابہ آگے کر دیا اور علامہ کے ہاتھ دھلوائے۔ رات کو نمکین کشمیری چائے بہت پابندی سے پیتے تھے۔ آخری سالوں میں رات کا کھانا موقوف ہو گیا تھا لیکن کشمیری چائے کا دور ضرور چلتا تھا جس میں ان کے نیازمند بھی اکثر شامل ہو جایا کرتے تھے۔

پھلوں میں آم بے حد پسند تھا۔ موسم آنے پر بازار سے بھی منگواتے، دوست احباب بھی بھیجتے۔ چنانچہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی کے پارسل کی رسید دیتے وقت یہ شعر لکھ بھیجا تھا:

تیرے فیض مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبرؔ
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

سال بھر میں ایک آدھ مرتبہ میاں نظام الدین کے باغ میں آموں کی دعوت ہوتی جس کی "صدارت" علامہ فرماتے اور ہم لوگ صبح سے جو آم کھانا شروع کرتے، تو ایک بجے کی خبر لاتے۔ بہترین دانے علامہ کی خدمت میں پیش کیے جاتے اور آموں کے متعلق وہ معنی آفرینیاں ہوتیں کہ باغ قہقہہ زار بن جاتا۔

آخری علالت کے دوران میں جب دلی کے حکیم نابینا صاحب مرحوم کا علاج جاری تھا، حکیم صاحب نے آموں سے پرہیز کا حکم دیا۔ آخر علامہ کے اصرار پر صرف

ایک آم روزانہ کھا لینے کی اجازت دیدی۔ ایک دن میں تیسرے پہر حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ بدستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی تپائی پر کوئی سیر بھر کا "بمبئی آم" پلیٹ میں رکھا ہے۔ میں نے کہا حضرت یہ کیا؟ حکیم صاحب نے تو پرہیز بتایا ہے۔ کہنے لگے ہاں لیکن ایک آم کھانے کی تو اجازت ہے اور بہرحال یہ آم ایک ہی ہے، دو تو نہیں ہیں جن دنوں جاوید اور منیرہ کے لئے ایک جرمن گورنس مقرر ہوئی تو علامہ نے گھر بھر کا انتظام اسی کے سپرد کر دیا۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی پڈنگ بنا لیتی، کبھی آئس کریم بنا لیتی اور بڑے اصرار سے علامہ کو بھی کھلاتی۔ بلکہ دو دفعہ علامہ نے ہمیں بھی "میم صاحب کی آئس کریم" کھانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی اور ناگواری ظاہر کرتے اور جب خمیرۂ مروارید بورق نقرہ پیچیدہ ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ ہاں یہ ہے نادر دوا جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جائے۔ مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے، اس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

مرض الموت میں غذا کے متعلق جس ذائقہ میں زیادہ لطافت پیدا ہو گئی تھی حکیم محمد حسین صاحب قرشی سے ایک گفتگو کا خاکہ ملاحظہ ہو، "اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے، یہ تو سادہ غذا ہے۔" "آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجیے۔" "ہاں تو کھچڑی گھی میں تلی ہوئی ہونی چاہیے، جس میں گھی کافی ہو۔" "گھی کم ہونا چاہیے، کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے۔" "تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہو گی؟ اچھا کم از کم اس میں دہی تو ملا جائے۔" "مگر آپ کو کھانسی ہے، اور تولید بلغم کی شکایت ہے۔ جس میں دہی مضر ہے۔" "تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے۔"

علامہ اپنی بیرسٹری کے سلسلے میں جب عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے۔ ہیٹ شاید کبھی طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی انگلستان میں پہنی ہوگی۔ یہاں ہم نے انھیں ہیٹ لگائے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ انگریزی سوٹ کے ساتھ نکٹائی کی جگہ عام طور پر کالی بوکلپ سے لگا لیتے، لیکن جتنی دیر سوٹ پہنتے، کچھ گھبرائے سے رہتے اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ چار جامہ اترواؤ اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ۔ پرائیوٹ لباس یہ تھا: سر پر ترکی یا کلپاک ٹوپی، سردیوں میں پشاوری پٹکا، قمیص، شلوار، چھوٹا کوٹ، پاؤں میں دیسی جوتا۔ چند بار شیروانی بھی پہنی ہے۔ اسی لباس میں تقریبات میں جاتے اور دوستوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ گھر پر گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد۔ سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پر صرف ایک قمیص کا اضافہ ہو جاتا۔ البتہ پشمینے کا دھسہ اوڑھے رہتے۔ سر کشن پرشاد نے دوران قیام حیدر آباد میں ایک تھان اعلیٰ درجے کی جامے وار کا پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی شیروانی سلوائی اور دو چار روقعہ شوق سے پہنی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے جسم پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ اس لباس میں ایک عقیدت مند نے عکسی تصویر بھی لی تھی، جو بعض رسالوں میں شائع ہو گئی تھی۔

دوران وکالت میں معمول تھا کہ عدالت سے واپس آ کر اپنا گھریلو لباس زیب تن کرتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے۔ ساتھ ہی حقہ لگا ہوتا تھا۔ حقہ پیتے، کتابیں پڑھتے، مقدمات تیار کرتے، ملنے والوں سے باتیں کرتے۔ جب

وکالت کا مشغلہ علالت کی وجہ سے ختم ہو گیا، تو زیادہ وقت بستر پر گزرتا تھا۔ تکیہ لگا ہے، معمولی سی توشک پر دری اور چادر بچھی ہے۔ اور اس پر یہ پیکرِ علم و فضل جلوہ گر ہے۔ علی بخش حقے کے معاملہ میں بڑا باقاعدہ اور پابند تھا۔ تمباکو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا۔ علی بخش بڑے اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا، کیونکہ اس کے سوائے کوئی اور کام ہی نہ تھا۔

۱۹۲۱ء تک تو علامہ انارکلی بازار کے ایک بالاخانہ میں رہتے تھے۔ بازار کی جانب کمرے میں کتب خانۂ قانونی، درمیانی کمرہ خالی، عقبی کمرے میں علامہؒ کی کرسی اور بستر، اللہ اللہ خیر سلا، زنانہ حصہ دوسری منزل پر جب میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں پہنچے، جب بھی کمروں کی ترتیب انگریزی نہ تھی۔ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں وہی بستر اور کرسی، بڑے کمرے میں ایک بڑا قالین اور صرف ایک سوفا، ایک کرسی خود علامہ کے لئے، چند کرسیاں آنے جانے والوں کے لئے اللہ بس باقی ہوس۔ لیکن زیادہ تر برآمدے میں بیٹھتے تھے۔ ڈرائنگ روم، بیڈروم، ڈائننگ روم کے بکھیڑوں سے نفرت، اول تو دعوت اور مہمانداری کا اتفاق شاذ ہی ہوتا تھا لیکن جب کبھی پانچ چھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دیتے، بڑے کمرے میں قالین پر دسترخوان بچھ جاتا، اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ہم نے علامہ کے ہاں مہمان شاذ و نادر ہی دیکھے۔ البتہ مولانا گرامی جب کبھی آتے مہینہ مہینہ دو دو مہینے قیام فرماتے اور ان کی مہمان داری کا اہتمام بطور خاص کیا جاتا، اور یہ اہتمام بھی کیا تھا! وہ بھی علامہ کی طرح سیدھے سادے

بزرگ تھے۔ دن میں ایک دفعہ کھانا کھاتے، باقی اوقات میں چائے پیتے، لہذا علامہ کے ساتھ ان کی خاصی نبھ جاتی تھی۔ علامہ میں ایک بات عجیب تھی کہ شدید گرمی میں بھی پنکھا نہ لگاتے تھے۔ ایک چھوٹی سی دستی پنکھیا پاس پڑی رہتی تھی، کبھی کبھی اٹھا کر جھل لیتے، اور بس۔ جب کبھی ہم اصرار کرتے کہ پنکھا منگا لیجئے، ہم سے تو اس گرمی میں بیٹھا نہیں جاتا، تو علی بخش سے کہہ کر ٹیبل فین لگوا دیتے لیکن اس کا رخ اپنی طرف نہ ہونے دیتے۔ پسینہ چوٹی سے ایڑی تک پڑا بہتا لیکن وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اس کے مقابلے میں جب جاڑا پڑتا تو علامہ اپنی کرسی سے اتر کر مع دمسہ کے قالین پر آ بیٹھتے اور ایک بڑی انگیٹھی آگ تاپنے کے لیے آگے رکھوا لیتے۔

میں نے پہلے بھی ایک تقریر میں بیان کیا تھا کہ علامہ اقبال کے علم و فضل کا شہرہ ان کی شاعری اور ان کی تصانیف سے نہیں ہوا، بلکہ اس کا ذمہ دار ان کا تکلم ہے۔ وہ دورِ حاضر کے بہت بڑے متکلم تھے۔ جس کو انگریزی میں Conversationalist کہتے ہیں۔ صبح سے رات تک یہ مردِ قلندر اپنے سادہ کپڑوں میں سیدھی سادی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھا رہتا اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صوبے کے سیاسی اکابر، وکلا، علما، کالجوں کے پروفیسر، اخباروں کے ایڈیٹر، شعرا، ادبا، طالب علم، ان پڑھ عقیدت مند، فقیر اور درویش غرض ہر قسم اور ہر طبقے کا انسان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون، فلسفہ، سیاست، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیرِ بحث آتے۔ اقبال ان سب پر اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے

علم و فضل سے مرعوب ہو کر جاتا۔ صوبے بھر کے تعلیم یافتہ حضرات اپنی ذہنی اور فکری الجھنیں علامہؒ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ انھیں سلجھا دیتے۔ ان کی مجلس میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا، بیٹھا رہتا۔ علامہ صاف صاف کہنا تو درکنار، اپنی کسی حرکت سے بھی اکتاہٹ کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ علم و فکر کے اس دربار میں سر فضل حسین، سکندر حیات خاں، جواہر لال نہرو، قائدِ اعظم محمد علی جناح، لارڈ لوتھیاں، ڈاکٹر سکارپا اور بیشمار دوسرے اکابرِ علم و سیاست حاضر ہوتے اور مستفیض ہو کر جاتے۔ علامہؒ کو بعض سے سیاسی اختلافات تھے، لیکن چونکہ خلوص و بے غرضی کا معاملہ تھا، اس لیے کسی سے ناگواری پیدا نہ ہوتی تھی۔

علامہؒ کے جلیس و ندیم

علامہؒ کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے والوں کی فہرست یوں تو بے حد طویل ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آغاز میں ان کے ہم نشین مرزا جلال الدین، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، فقیر سید نجم الدین، سر عبد القادر، سر محمد شفیع، سر شہاب الدین، سر فضل حسین، سر جگبندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ، نواب ذوالفقار علی خان اور راجا نرندر ناتھ تھے۔ دوسرے دور میں مولانا ظفر علی خان اکثر آکر ملتے تھے۔ اور گھنٹوں صحبتیں رہتی تھیں۔ خلیفہ شجاع الدین، خلیفہ عبد الحکیم، شیخ اکبر علی ارسطو، خان غلام رسول خان اکثر آتے۔ سالک اور مہر سالہا سال تک ہر دوسرے تیسرے دن حاضر ہوتے۔ اور شام سے آدھی رات تک مجلس جمی رہتی۔ مرتضیٰ احمد خان میکش بھی

کبھی کبھی حاضر ہوتے۔ چودھری محمد حسین سے تو کئی سال انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ علامہ کی طبیعت میں جس قدر درخور چودھری صاحب کو حاصل تھا، اس کا مقابلہ کوئی دوست یا جلیس نہ کر سکتا تھا۔ آخری ایام میں حکیم محمد حسن قرشی، راجا حسن اختر، سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع (م۔ش) شب و روز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اور دوا و غذا اور دوسرے معمولات کی نگرانی بوجہ احسن کرتے۔

ملک لال دین قیصر ایک زمانے میں دن رات علامہ ہی کے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ چونکہ وہ قوم کے مجاہد خادم تھے۔ اس لئے اکثر قید ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کی والدہ ضعیفہ یہ سن کر کہ قیصر علامہ اقبال کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا عین دوپہر کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ یہ بیٹا میرے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے اور ہمیشہ کسی نہ کسی قصے میں قید ہو جاتا ہے آپ اس کو منع کیجیے۔ علامہ نے حسن تدبیر سے قیصر کو بعض خطرناک جلسوں اور تحریکوں سے باز رکھا۔ جب قیصر کی شادی ہوئی اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو والدہ قیصر اس بچے کو لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ آپ اس کے لئے دعا کیجیے۔ علامہ نے اس کو درازیٔ عمر، ترقی درجات اور سلامتیٔ ایمان کی دعا دی اور والدہ سے پوچھا کہ اس بچے کا نام کیا رکھا؟ ضعیفہ محترمہ نے کہا کہ میں اس کا نام اقبال رکھوں گی۔ (اقبال قیصر آج کل کاروبار میں مصروف ہیں اور ان کی دادی کا انتقال ہو چکا ہے)۔

علامہ کی گفتگو کبھی پنجابی میں اور کبھی سیدھی سادی اردو میں

ہوتی، مسائل کی سنگینی کی وجہ سے بعض اوقات اس گفتگو میں بشیار انگریزی الفاظ بھی داخل ہو جاتے لیکن علامہ کا اسلوب بیان ہمیشہ سلجھا ہوا ہوتا تھا. اردو بالکل پنجابی لہجے میں بولتے تھے. اکثر اہل زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے ایک گونہ تنفر پیدا ہوتا تھا. وہ شعر کی داد موقع بے موقع نہ دیتے تھے. آداب تسلیمات نہ کرتے تھے. آسانی سے کسی کو کلام نہ سناتے تھے. ہم نے بھی کبھی ان سے فرمائش کی جرارت نہ کی. لیکن جب کبھی رات کے وقت موج میں آتے تو گیارہ گیارہ بجے تک اپنا غیر مطبوعہ کلام سناتے. لیکن جو لوگ اہل زبان سے اہل علم زیادہ ہوتے تھے، وہ انتہائی احترام سے علامہ کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے ہوئے واپس جاتے.

مرزا جلال الدین صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سلسلے میں یہاں یو.پی کے رئیس راجا نوشاد علی کو دعوت دی گئی. وہ سر محمد شفیع کے ہاں ٹھہرے. ایک دن چائے پیتے ہوئے کہا کہ سر سید نے پنجابیوں کی زندہ دلی کی تعریف کی ہے. یہاں آکر تو ہمیں کوئی زندہ دلی نظر نہیں. مرزا جلال الدین نے کہا: آپ کانفرنس کے بعد مزید ایک دن قیام فرمایئے. پھر آپ کو زندہ دلی کا اندازہ ہو گا. اس دعوت کے موقع پر کھانا تو نواب ذوالفقار علی خاں کے ہاں زرافشاں' میں ہوا. اس کے بعد احباب جلسۂ رقص و سرود کے لئے مرزا جلال الدین کے ہاں چلے گئے. مرزا صاحب نے اس زمانے کی نامور طوائف بہاروکو بلا کر راجا نوشاد علی خان کو اس کا گانا سنوایا وہ بیحد مسرور و محظوظ ہوئے. جب وہ رخصت ہو گئی تو نوشاد علی خان نے علامہ سے کہا: حضرت! آپ کی

زبان سے آپ کا کلام سنے مدت گزر گئی۔ کچھ ارشادات فرمائیے۔ علامہ نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہر شخص نے تقاضا کیا لیکن علامہ نے ایسی نا پکڑی کہ پوری محفل منغص ہو گئی جب راجا نوشاد علی خان چلے گئے اور دوستوں نے علامہ سے پوچھا کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ آپ نے جواب دیا: "یہ شخص وجاہت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاہتا تھا میں وجاہت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا۔"

فرمائش پر کلام سنانا علامہ کی عادت کے قطعاً خلاف تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ یو۔پی سے کوئی شاعر ملنے آئے اور آج کل کے شعرا کے رواج کے مطابق انھوں نے چاہا کہ کچھ علامہ سے سنیں اور کچھ اپنا کلام سنائیں لیکن علامہ نے انھیں ہمیشہ مایوس ہی کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس سلسلے میں دو واقعات سنائے جن کو مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔ جب علامہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو ایک دن جوش ملیح آبادی نے اپنے چند دوستوں کو دعوت دی اور علامہ کو مدعو کیا۔ علامہ نے اس دعوت کا ذکر خلیفہ صاحب سے کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مدعو نہیں ہیں۔ بہرحال علامہ چونکہ دعوت قبول کر چکے تھے، لہٰذا چلے گئے۔ جوش کا مقصد اس محفل سے یہی تھا کہ کچھ اپنا کلام سنائیں اور کچھ علامہ سے سنیں۔ انھوں نے علامہ سے فرمائش کی۔ علامہؒ نے کہہ دیا کہ "مجھے یاد نہیں"۔ بہتیرا تقاضا کیا، منت سماجت کی علامہ نے ایک شعر بھی نہ سنایا۔ پھر جوش اپنا کلام کیا سناتے۔ چنانچہ یہ مجلس "مشاعرے" کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے تعلقات مدت سے دوستانہ چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ ان کی طویل خط و کتابت بھی شادِ اقبال"

کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مہاراجا صاحب نے علامہؒ کے اعزاز میں ایک نہایت شاندار دعوتِ طعام کا اہتمام کیا۔ جب علامہ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ دعوت اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ مجھ سے اس مجمع میں شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے۔ مہاراجا بےحد پریشان ہوئے۔ کیونکہ ان کا مقصد تو یہی تھا کہ اکابر حیدرآباد کو علامہ کا کلام سنوائیں لیکن چونکہ علامہ کی شرکت اس پابندی سے مشروط تھی، لہٰذا ناچار مہاراجا صاحب نے قبول کیا۔ علامہ شریکِ محفل ہوئے۔ وہاں بعض شعرا و امرا نے اپنا کلام سنایا اور ایک دوسرے کو خوب فرمائشی داد دی۔ علامہؒ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں ان سے کلام سنانے کی استدعا کی گئی تو انھوں نے انتہائی تنغض سے جواب دیا "یاد نہیں"۔ بڑے بڑے امرا و حکام نے مہاراجا صاحب سے گذارش کی کہ وہ حضرت علامہ کو آمادہ کریں۔ لیکن وہ پابندیٔ عہد سے مجبور رہتے آخر بہت ہی ناچار ہو کر انھوں نے گذارش کی کہ حضرت یہ سب لوگ آپ سے عقیدت کی وجہ سے کلام کے طالب ہیں۔ ان کو محروم رکھنا قرینِ مروت نہیں معلوم ہوتا۔ بہت سی حیص بیص کے بعد علامہؒ نے مجبوراً فارسی کے صرف دو شعر سنائے:

بگزر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو — کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ — ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

لیکن مہاراجا صاحب دیکھ رہے تھے کہ علامہ نہایت منغض ہو کر شعر سنا رہے ہیں چنانچہ انھوں نے مزید فرمائش نہ کی۔

علامہ کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں اور مذاکروں ہی میں گزرتا تھا۔ پھر تعجب

ہے کہ وہ مطالعہ کس وقت کرتے تھے اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ یورپ سے جدید ترین سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے متعلق انگریزی اور جرمن زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی تھیں، ان کو علامہ باقاعدہ پڑھتے تھے۔ ملک بھر کے اخبارات اور رسالے ان کے نام آتے تھے، لیکن وہ ایک دو مقامی اخبارات کے سوا باقی سب کو کھولتے بھی نہ تھے اور علی بخش کو بلا کر اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ ہم علی بخش سے بارہا اچھے اچھے رسالے پڑھنے کے لئے لے جایا کرتے تھے، باقی وہ ردی میں بیچ دیتا تھا۔

صبح کی نماز اور تلاوتِ قرآن مجید علامہ کا باقاعدہ معمول تھا اور تلاوت کے وقت کلامِ الٰہی کے اثر سے اکثر اشکبار ہو جاتے تھے۔ غیرتِ اسلامی کے پیکر تھے۔ اسلام، شارعِ اسلام، اکابرِ تاریخِ اسلام کی ذرا سی بے حرمتی پر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ عشقِ رسولؐ ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا۔ حضور سرورِ کائناتؐ کا ذکر ذرا مؤثر طور پر ہوا اور علامہ کے آنسو جاری ہوئے۔ پھر جب تک خود بخود طبیعت ہلکی نہ ہو جاتی تھی ان کی گریہ وزاری کو کوئی نہ روک سکتا تھا۔

اسمائے الٰہی اور کلامِ الٰہی اور دوسرے بابرکت کلمات کی تاثیرات کے بھی قائل تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے ذکر کیا کہ کل میری بیوی کے سر میں درد ہوا جو کسی تدبیر سے نہ گیا۔ آخر میں نے قصیدہ بردہ کا فلاں شعر کاٹ کر اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ چند منٹ میں درد کافور ہو گیا۔

والدۂ جاوید کا دل بہت کمزور تھا، بہت جلد ڈر جاتی تھیں۔ ایک دن خفیف سا

زلزلہ آیا تو بے ہوش ہوگئیں۔ اعزا نے علامہ کو باہر سے بلوایا۔ وہ آکر پاس بیٹھ گئے والدۂ جاوید کو ہوش آیا تو ان کا دل بہلانے کے لئے کہانیاں سناتے رہے۔ پھر فرمایا: کہانیاں تو سن لیں۔ اب اللہ کا ذکر کرو قرآن میں آیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔ پھر خود بلند آواز سے یا حی یا قیوم پڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ کمرہ گونج اٹھا۔ والدۂ جاوید پھر ڈر گئیں۔ علامہ پھر انہی اسما کا ورد کرتے کرتے باہر تشریف لے گئے۔*

طبیعت میں مزاح و تفنن بھی تھا۔ لطیفے کی قدر کرتے تھے اور خود بھی لطائف و ظرائف سے ہم نشینوں کو ہنساتے رہتے تھے۔ دن بھر میں پچاسوں آدمی ان سے ملنے آتے اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ اسی سلسلے میں ہر حلقے کی خبریں بھی علامہ تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ ان خبروں کو سن کر دوسرے احباب تک پہنچا دیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، راقم نے ڈاکٹر صاحب کو ایک اہم سیاسی خبر سنائی اور کہہ دیا کہ فی الحال آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیے گا۔ دوسرے دن شام کو میں حاضر ہوا تو بڑی رازداری سے وہی خبر مجھے سنا دی کہ کوئی صاحب مجھے یہ خبر سنا گئے ہیں۔ آپ فی الحال کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے کہا، حضرت! یہ خبر تو میں ہی کل آپ کو سنا گیا تھا۔ علامہ ہنس دیئے اور کہنے لگے گویا میرے ذہن میں خبر ہی رہ گئی اور خبر دینے والا نہ رہا۔

میں نے بہت کم لوگوں کو علامہ اقبال جیسا خوش معاملہ پایا ہے۔ وہ روپے پیسے کے معاملہ میں بے حد دیانت دار اور محتاط تھے۔ پہلی بیگم کو جتنی رقم ماہوار ادا

---

* بیان محمد نذیر صوفی داماد شیخ عطا محمد۔

کرنے کا وعدہ کیا، نہایت پابندی سے تا دم مرگ ادا کرتے رہے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی نہایت بدنما اور بوسیدہ تھی۔ پونے دو سو روپے ماہوار اس کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ ہزار دفعہ عرض کیا کہ یہ کوٹھی اتنے کی نہیں، آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے۔ جس کے بچوں کی گذران اسی کے کرایہ پر ہے، کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دو سو روپے اس بیوہ کو بھیجدیا کرتے تھے لدھیانے والی بیگم اور لاہور والی بیگم دونوں بیک وقت علامہ کے ہاں رہیں۔ لیکن ان کے درمیان سوکناپے کا کوئی معاملہ نہ تھا۔ بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ علامہ کو کبھی ایک لمحے کے لئے کوئی ایسی شکایت نہ پیدا ہوئی جو دو بیویوں والوں کو ہوا کرتی ہے۔ وہ خود بھی ان دونوں میں انتہائی عدل مدنظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے دونوں بیگموں کے لئے زیور بن کر آئے۔ جب سنار نے ان کو تولا، تو ایک زیور کوئی دو ماشے کم نکلا۔ علامہؒ نے دو ماشے سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ اپنی بیگم کو ادا کر دی۔ تاکہ اسے بے انصافی کی شکایت نہ ہو۔

علی بخش عمر بھر ان کا خدمت گار رہا۔ وہ ان کا شیفتہ تھا اور ان کو بھی علی بخش کے سوا اور کسی ملازم کے کام سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ علی بخش چھٹی لے کر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا۔ جب واپس آیا تو رحمے نے پریشانی ظاہر کی کہ اب میں کہاں جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چلو تم بھی رہو۔ اس کے بعد رحما کہیں چھٹی پر گیا اور اپنی جگہ ایک اور شخص دیوان کو رکھوا گیا۔ جب واپس آیا تو یہ تیسرا نوکر پریشان ہوا۔ علامہؒ نے اس کو بھی رکھ لیا۔ آخر ہم نے بھی علامہ سے کہا کہ آپ

کے ہاں کام تو کچھ بھی نہیں اور نوکر تین تین ہیں. آخر اس اصراف کا کیا مطلب ہے؟ لیکن انھوں نے سنی ان سنی کر دی. اور تینوں نوکر آخر تک رہے.

ایک دفعہ علامہ نے دوستوں کے کہنے سننے سے ایک موٹر کار خرید لی اور ایک شخص فیروز اس کا ڈرائیور مقرر ہوا. ڈاکٹر صاحب گل محمد قسم کے آدمی، نہ کہیں آنے کے نہ کہیں جانے کے. فیروز دن بھر بیکار پڑا رہتا تھا. آخر اس نے تنگ آ کر کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ہی خوانچہ لگا لیا. ڈرائیوری کی تنخواہ علامہ سے وصول کرتا رہا اور خوانچے سے بھی ڈیڑھ دو روپے روز پیدا کر لیتا تھا. کبھی پندرہ بیس دن میں علامہ کہیں گئے تو موٹر میں انھیں لے گیا ورنہ اللہ اللہ.

ہم نے بارہا دیکھا، علامہ اقبال شدید درد کو برداشت نہ کر سکتے تھے جب بھی درد ہوتا، خاصا شور مچاتے اور عمل جراحی کا تو خیال بھی ان کے لیے ہلاکت خیز تھا لیکن عام طور پر خطرات کے وقت اپنا دماغی توازن قائم رکھتے تھے. علی بخش کا بیان ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جب کانگڑہ کا مشہور زلزلہ آیا، میں علامہ کے پاس اندرون بھاٹی دروازہ بالاخانے میں رہتا تھا. یہ زلزلہ نہ تھا، خدا کا قہر تھا. کواڑ کھڑ کھڑا رہے تھے چھتیں چیخ رہی تھیں. دیواریں یوں ڈول رہی تھیں گویا ابھی تمام مکانات پیوند خاک ہو جائیں گے. اور حقیقت میں بہت سے مکانات گر بھی پڑے تھے. میری حالت دوران زلزلہ میں یہ تھی کہ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا. کبھی پھر نیچے اتر آتا. لیکن علامہ صاحب شروع سے آخر تک اپنے پلنگ پر بیٹھے کتاب پڑھتے رہے اور ان میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی. صرف ایک دفعہ میری گھبراہٹ دیکھ کر کتاب سے نظریں اٹھائیں اور کہا: علی بخش "یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو.

سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ" یہ کہہ کر پھر بدستور مطالعہ میں مصروف ہو گئے*

قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی۔ وکالت کا بھی یہی تھا کہ کبھی کبھار کوئی مقدمہ لے لیا اور شہرت و ناموری حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ علامہؒ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے تھے جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا ہو جاتا۔ مصارف خانگی میں انتہائی کفایت مدنظر تھی۔ آمد و خرچ کا حساب نہایت باقاعدہ رکھتے تھے اور آخر دم تک اس شعار پر کاربند رہے۔ جب اواخر عمر میں علالت کی وجہ سے ذرائع آمدنی مفقود ہو گئے اور نواب بھوپال نے پانچسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، تو علامہؒ نے اپنے مصارف کے لیے اسی کو کافی سمجھا۔ سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا:

میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایان شان نہیں آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیوں کہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے+

سادگی پسندی کے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو: پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم

* حیاتِ اقبال تاج کمپنی ۳۵ + مکاتیبِ اقبال، عطاء اللہ

اور ایک دو اور مشہور قانون داں صاحب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو عیش و نعم کا سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسولؐ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گذار ی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر ان کے لیے لیٹنا ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسلخانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور مسلسل رونا شروع کیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا۔ ایک چارپائی اسی غسلخانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسلخانے ہی میں سوتے رہے۔ *

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ غیرت کا نقصان صرف احتیاج کی وجہ سے ہوتا ہے اور قانع آدمی محتاج نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد دکن نے علامہ اقبال کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔ چونکہ یہ دوستانہ ہدیہ نہ تھا، بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ لینا علامہ کی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ اس لیے آپ نے ان اشعار کے ساتھ چیک واپس کر دیا:

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

---

* جوہر اقبال۔ مولانا مودودی

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات *

جائز و ناجائز کے متعلق بیحد محتاط تھے۔ وکیلوں کے پاس موکل عام طور پر تحائف و ہدایا لاتے ہیں اور یہ محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ علامہ کو ان تحفوں کی قبول میں بھی تامل تھا، چنانچہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کر کے سوال کیا ہے، کہ آیا ایسا مال مسلمان کے لئے حلال ہے۔ ‡

بزرگوں کے ادب میں انتہائی اہتمام کرتے تھے۔ پروفیسر منظور احمد (ہمشیر زادہ علامہ) بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ علامہ اقبال سیالکوٹ میں رحیا عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ دھرا تھا۔ علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ جو پاؤں تختے پر تھا اس کا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ ادھر سے گزرے اور علامہ اقبالؒ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ جھٹ تختے پر سے پاؤں نیچے کیا تختے کا جوتا تختے پر چھوڑا اور صرف ایک پاؤں میں جوتا پہنے اپنے استادِ محترم کی طرف لپکے۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ اقبال گردن جھکائے ان کے پیچھے پیچھے

---

* ارمغان حجاز ‡ مکاتیب اقبال حصہ اول

مؤدبانہ جارہے تھے۔ ایک پاؤں میں جوتا تھا اور ایک پاؤں میں نہ تھا حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ اور پھر اپنا جوتا پہنا۔ آج کل کے زمانے میں اس ادب و اخلاق اور طبعی سعادت کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے؟

غرض علامہ نہایت سادہ مزاج، درویش صفت، متوکل اور عاشق رسول مسلمان تھے۔ علم و فضل اور شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی ان کی منکسر مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ غربا کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے اور امرا کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ان سے دلی محبت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا جس میں کسی کی طرف سے بھی کدورت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

پانچواں باب

ارشاداتِ علاّمہ اقبالؒ

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری دانہ

علامہ اقبال نے زندگی بھر معلم و متکلم کی حیثیت سے روزانہ بیسیوں تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔ لہٰذا ان کے ملفوظات وارشادات کا ذخیرہ بے پایاں ہے۔ ان کے ہر ملاقاتی کے پاس ان کا کوئی نہ کوئی ارشاد محفوظ ہے اور ایسے تمام ملفوظات کی فراہمی اور جمع آوری بے انتہاد شوار ہے۔ بہرحال اس فصل میں علامہ کے چند ارشادات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کی علمی و افادی حیثیت مسلم ہے۔ بعض وجدانی کیف کے سرمایہ دار ہیں اور بعض کی نوعیت تفریحی ہے لیکن ان کے مجموعی مطالعہ سے علامہ کے انداز فکر و ذکر کا پتہ چلتا ہے۔

الہامِ لفظی ایک دفعہ کا ذکر ہے فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس تھا جس میں علامہ بھی مدعو تھے۔ کالج کے پرنسپل لوکس نے علامہ سے کہا کہ آپ اجلاس اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا ٹھہریئے گا۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبیؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا، جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلعم پر نازل ہوتی تھی۔ یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں۔ ڈاکٹر لوکس نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ جیسا عالی پایہ فلسفی Verbal Inspiration (الہامِ لفظی) پر کیوں کر اعتقاد رکھ سکتا ہے۔ علامہؒ نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! اس معاملہ میں میں کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں محض شاعر ہوں۔ جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں۔ اور میں انھیں بعینہٖ نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنی چاہی، لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا۔ جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے، تو اس میں کیا مقامِ تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ نازل ہوتی تھی؟ اس پر ڈاکٹر لوکس لاجواب ہو گئے۔

کیفیت شعر سوال کیا گیا کہ آیا آپ پر شعر کہنے کی کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے؟ فرمایا نہیں. ایسی کیفیت سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار ہوتی ہے. لیکن اس وقت مضامین کے ہجوم کی حالت وہی ہوتی ہے جیسے کسی ماہی گیر کے جال میں اس کثرت سے مچھلیاں پھنس جائیں کہ وہ پریشان ہو جائے اور سوچ میں پڑ جائے کہ کس کو پکڑوں اور کس کو چھوڑوں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل مدت کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس سے پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو شعر کہے تھے ان کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے. گویا یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں. جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں .

قبض اور بسط پھر فرمایا: ایک دفعہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ خدا نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے چنانچہ میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ مبذول کر دی لیکن ایک دن یک بیک وہی کیفیت عود کر آئی . وہ اس قدر بھرپور تھی اور اتنی دیر تک رہی کہ چھ سات سال کے جمود کی تلافی ہو گئی .

کسی قدر توقف کے بعد کہنے لگے کہ جب جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے جرمن زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے. اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے. اس لئے وہ جب کوئی الہامی کتاب

پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہوسکتی *

ایک اور موقع پر فرمایا: مجھ میں فکرِ شعر کی جو تحریک پیدا ہوتی ہے اس کو جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جاسکتا ہے اور حالتِ حمل سے بھی۔ جب تک میں اس تحریک کی تعمیل میں شعر نہیں کہہ لیتا مجھے سکون میسر نہیں ہوتا اور وہ سکون تکان اور ماندگی لئے ہوئے ہوتا ہے۔

حلال و حرام

ایک مرتبہ فرمایا: فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے۔ نورِ ایمان بھی کسبِ حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ بغداد کے ایک بزرگ کے متعلق فرمایا: ان کی ہمشیر قاضی شہر کے پاس گئیں اور سوال کیا کہ ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے۔ اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے میں اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں۔ فرمایئے کہ شریعت کی رو سے پڑوس کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام؟ قاضی تقویٰ کا یہ لطیف احساس دیکھ حیرت زدہ ہوگیا۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ خاتون نے جواب دیا میں فلاں درویش کی ہمشیر ہوں۔ قاضی نے کہا: آپ کے لئے حرام ہے۔ دوسروں کے لئے حلال۔ اس ذکر سے علامہ پر سخت رقت طاری ہوگئی۔ جس سے ہم نشین بھی متاثر ہوئے +

---

* روزگار فقیر + راجا حسن اختر کا مضمون

عقل و عشق ایک دفعہ علامہؒ سے سوال کیا گیا: عقل کی انتہا کیا ہے؟ جواب دیا حیرت۔ سوال کیا گیا عشق کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لاانتہا ہے۔ مستفسر نے کہا پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے۔ "ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں" مسکرا کر فرمایا: دوسرا مصرع بھی تو پڑھیے۔ جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے کہ "میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں*"

خدا سے مِلنا! ایک بار ایک درویش علامہؒ کے پاس آیا۔ آپ نے حسبِ عادت اس سے دعا کی درخواست کی۔ پوچھا دولت چاہتے ہو؟ علامہؒ نے جواب دیا: میں درویش ہوں۔ دولت کی ہوس نہیں۔ پوچھا عزّ و جاہ مانگتے ہو؟ جواب دیا: وہ بھی خدا نے کافی بخش رکھی ہے۔ پوچھا تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟ جواب دیا: سائیں جی کیا کہہ رہے ہو۔ میں بندہ وہ خدا۔ بندہ خدا سے کیوں کر مل سکتا ہے؟ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔ نابود ہو جاتا ہے۔ میں قطرے کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں۔" یہ سن کر اس درویش پر خاص کیفیت طاری ہوئی۔ بولا: "بابا جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تو تو خود آگاہِ راز ہے۔ تجھے کسی کی دعا کی ضرورت ہے!" +

بیعت کی اہمیت علامہ اقبال نسبتِ بیعت کے قائل تھے۔ چنانچہ خود مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں: "یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے۔ جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں"۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے مئی ۱۹۳۵ء میں بیان کیا "اقبال نے رازداری کے طور پر مجھے کہا

---

* دو قرآن از برق + مضمون سالک دو شیرازہ

تھا کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں۔ اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے۔ وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔"

مہاراجا سر کشن پرشاد کو ایک خط ۱۹۱۷ء میں لکھا جس میں علامہ اپنے صاحبزادے اقبال کے متعلق لکھتے ہیں: "لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین وطباع ہے۔ مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آجکل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرادوں، یا اس کی شادی کردوں۔ کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

نازتا ناز است کم خیزد نیاز ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز *

احیائے موتی ایک پروفیسر صاحب علامہؒ کی خدمت میں حاضر تھے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے کہا "ڈاکٹر صاحب آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوئی"۔ کہنے لگے: "یہ صحیح نہیں۔ مختار قوم اپنے محکموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اس لئے مسلط کر دیتی ہیں کہ ان میں پھر سے کھوئی ہوئی طاقت پیدا کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہ ہو سکے۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے۔ آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہو سکتی۔ مگر خیال فرمائیے، قرآن تو قیامت کا قائل ہے وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم تو کیا، ساری دنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہو جائے گی۔ +

پنج ارکان کافی ہیں سوال کیا گیا کہ آپ کے مدراس والے لیکچر بجد مشکل ہیں۔

* شاد اقبال + ملفوظات اقبال (بیان سید الطاف حسین)

اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے جو آپ نے ان لیکچروں میں بیان فرمایا ہے اور جس کو اس زمانے کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں تو قرن اوّل کے عرب صحرانشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: بنی الاسلام علی الخمس یعنی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان (شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ حج) کا اجرا و انضباط کافی ہے۔ چنانچہ اس کی محسوس اور عملی صورت عہدِ سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی۔ اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔* (مطلب یہ تھا کہ عرب کے صحرانشینوں نے پنج ارکان اسلام پر مخلصانہ عمل کر کے جو کچھ حاصل کر لیا تھا، اسی کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہم مشکل بحثوں میں پڑتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی وجدان بیدار ہو جائے)۔

اصلاحاتِ صوفیہ سوال کیا گیا: صوفیہ کے اذکار مخصوصہ اور مصطلحات مدارج (غوث، قطب، ابدال) وغیرہ کا تعلق نفس اسلام سے کیا ہے؟ صحابہ میں مومن، صالح، شہید، صدیق وغیرہ الفاظ تو ملتے ہیں لیکن ان مدارج کا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا: واقعی جناب رسالت مآب اور صحابہ کرام کے زمانے میں نہ یہ اصلاحات تھیں اور نہ اس قسم کے اذکار و اوراد۔ اسلامی تصوف مجوس، ہنود اور نصاریٰ کے تعلقات سے کافی حد تک متاثر ہوا ہے۔+

برزخ حیات بعد الممات کے متعلق استفسار کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: حیات

* ملفوظات اقبال بیان عرشی + ملفوظات اقبال بیان عرشی

اخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدت پر منحصر ہے. جس قدر کسی شخص میں ذوقِ زندگی زیادہ ہوگا، اتنا ہی اس کا زمانہ برزخ کم ہوگا. شہدا کا ذوق زندگی بہت بڑھا ہوا ہے! اس لیے ان کے لیے کوئی برزخ نہیں! اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کے لیے دوسری زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے" عرض کیا: عام مومنین کے لیے بھی برزخ کا کہیں ذکر نہیں. فرمایا: اس کا سبب بھی ذوقِ حیات ہے. میں نے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے.

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
انساں بمیرد از بے یقینی *

لاتسبوا الدہر ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے سوال کیا کہ حدیث میں ہے کہ دہر کو برا مت کہو. دہر خدا ہے. اس کا مطلب کیا ہے؟ پہلے تو علامہؒ کچھ ہوں ہاں کرتے رہے. آخر کہا کہ حقیقت (Reality) کا لازمی جزو دہر ہے. اتنا کہا اور خاموش ہو گئے. پھر فرمایا: پیرس میں جب برگساں سے ملاقات ہوئی تو اسے نقرس کی شکایت تھی. پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا. نوکر کرسی کو چلا کر اِدھر سے اُدھر لے جاتا تھا. میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اچھل پڑا. پوچھا یہ کون کہتا ہے؟ میں نے کہا ہمارا رسول (صلعم)، وقت کو ہم Eternal مانتے ہیں مگر وہ بھی گزر رہا ہے. اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم Now کہتے ہیں وہ Eternal Now بن جاتی ہے. Reality دو معنوں میں لی جا سکتی ہے. ایک Extensive دوسرے Intensive مراد یہ ہے کہ ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرے اور ہر گردش میں اس کا

* ملفوظاتِ اقبال. بیان عرشی

رنگ بدل جائے۔ وقت کو اسی طرح تصور کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کر رکھی ہے۔ ورنہ وقت تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت تو غالباً ایک خدا کو مانتا تھا۔ مگر ایران میں یزداں اور اہرمنا کی ثنویت قائم تھی۔ ایک روشنی (دن)، اور دوسرا تاریکی (رات) ان دونوں کا اجتماع Real ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار دن اور رات کا ذکر آیا ہے۔ ہندو تو اس وقت کو مانا کہتا ہے۔ بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے اور اس کے حصے کیے ہیں۔ وقت کا Atomic تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد علامہ خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا: وقت کا تصور "شخصیت" کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان صداقت کا متلاشی تھا۔ ایران جمال کا اور عرب جلال کا۔ اسلام نے ان تینوں کو "شخصیت" Personality میں جمع کر دیا۔"*

تصوف دین نہیں فلسفہ ہے

تصوف کے متعلق فرمایا: تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف، ایرانی تصوف۔ ہندوستانی تصوف سب انحطاطِ قومی کے نشان ہیں۔ اسلام کے اولین دور کے صوفی زہاد تھے۔ ان کا مقصد زہد و تقویٰ تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات اور نظریات بھی شامل ہو گئے۔ اس کے بعد تصوف محض زہد نہیں رہتا۔ بلکہ اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ "ہمہ اوست" مذہبی مسئلہ نہیں۔ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے۔ اور اس کی ضد کثرت نہیں، شرک ہے۔ وہ

---

* ملفوظاتِ اقبال بیان ڈاکٹر سعید اللہ

فلسفہ اور مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشوونما کے منافی ہو۔ بے کار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹیفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔ تعویذ تلاش کرتے ہیں، گوش و چشم کو بند کر دینا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جدوجہد سے کرنے کی سہل طریقوں کی تلاش ہے۔ تسخیر ممنوعہ میرا خیال ہے کہ تصوف ہی سے مراد ہے خالص اسلامی تصوف یہ ہو کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔ یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن*

وجد و حال فنونِ لطیفہ

وجد و حال کا ذکر آیا تو علامہؒ نے فرمایا: وجد و حال کو لوگوں نے دستور بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوشش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل جب مسلمان عرب سے نکلے اور انھیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور وجد و حال انھی فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ ...... مسلمان جہاں جہاں پہنچے۔ وہیں کی موسیقی انھوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فن تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔

---

* ملفوظاتِ اقبال۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ

اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے، وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے۔ جن میں قوت و ہیبت کی ایک شان ایسی تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مغرب کا وقت تھا۔ جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔*

جہاد مصلحانہ بھی ہوتا ہے

سوال کیا گیا کہ جہاد جارحانہ ہونا چاہیئے یا دفاعی۔ علامہؒ نے فرمایا: عام طور پر تو دفاعی ہے۔ لیکن بوقتِ ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے مثلاً اگر کسی قوم کی بداخلاقی اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ بزورِ شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے۔ سلطان شہید ٹیپو نے ملیبار کے غیر مسلم وحشی باشندوں کو کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کر دو، ورنہ میں بزورِ شمشیر تم کو کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قرآن میں مسلمانوں

* ملفوظاتِ اقبال۔ بیان پروفیسر حمید احمد خان۔

کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ہو سکتی ہے اور مسلمان اگر امر و نہی کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے۔*

اجتہاد کی ضرورت

اجتہاد اور تشکیل فقہ جدید کی ضرورت عمر بھر علامہ کو محسوس ہوتی رہی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ تقریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلام پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے)۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں۔ یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاءاللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی ہی کا منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض یہ تنت علمی کام کا ہے۔ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے

---

* ملفوظات اقبال۔ بیان خواجہ عبدالوحید

کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے! اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا*

سمن

فرماتے ہیں: اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سر زمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہو گی۔ اسمیں نبی کریم صلعم فرماتے ہیں: میری امت میں تین قرنوں کے بعد 'سمن' (ولیظہر منہم السمن) کا ظہور ہو گا۔ میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار 'وکیل' امرتسر میں شائع کئے تھے جس سے مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ 'سمن' سے مراد رہبانیت ہے۔ جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ آئمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے۔ مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا ...... میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمینت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے۔ جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالاں کہ حضرت محی الدین (عبدالقادر جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا+

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ ایک روسی ترک عالم علامہ موسیٰ جار اللہ لاہور میں مقیم تھے اور چونکہ فارسی خوب جانتے تھے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ کے کلام کو خوب ذوق و

---

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۵۱-۵۰ + مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ ۸۷-۷۹

شوق سے پڑھتے اور جو مقامات سمجھ میں نہ آتے، ان کی تصریح کے لئے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔ بلکہ اشعار کے معانی کے علاوہ اسلامی نظریہ سیاست و نظامِ حکومت کے متعلق بھی علامہ سے استفسار کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے۔ ایک دن کا واقعہ ملفوظات میں درج ہے:

موسیٰ جار اللہ تشریف لے آئے۔ پردے کے متعلق ضمنی طور پر ایک بحث چھڑ گئی۔ علامہؒ نے فرمایا: فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں، پردے میں رہے۔ خود خدا کو دیکھئے بے حجاب نہیں۔ زندگی کو دیکھئے اگرچہ اس کے آثار کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ مگر جذبات خود وہ ہماری نظر سے پنہاں ہیں.... اس پر موسیٰ جار اللہ نے کہا کہ پردے کے قائل تو ہم بھی ہیں۔ لیکن حجاب رو کے قائل نہیں۔ علامہؒ نے فرمایا کہ قرآن تو حجاب رو کا قائل ہے۔

اسلامی نظامِ سیاسی پر اظہارِ خیالات کی ابتدا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: انسان ایک فردِ یکتا یا گوہر یکتا ہے جس کی ترکیب روح اور مادہ سے ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ نظامِ حکومت جو انسان کی محض جسمی یا مادی ضروریات پوری کرسکے، انسان کی تشفی نہیں کرسکتا۔ اور نہ نوعِ انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہو کر ارتقائی سیادت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اسلام دین و سیاست میں تفریق اسی لئے روا نہیں رکھتا، بلکہ انسان کی ہیئت ترکیبی ان ہر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت نہ جمہوریت ہے، نہ ملوکیت۔ نہ ارسٹا کریسی ہے۔ نہ تھیا کریسی۔ بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ہے۔*

* ملفوظاتِ اقبال ص ۲۴۴-۲۴۳

جنگ اور قرآن کسی معترض نے کہا کہ اقبال اس دورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے۔ اس پر فرمایا میں جنگ کا حامی نہیں ہوں اور نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ و مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے۔ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)۔ دوسری صورت میں جسمیں جہاد کا حکم ہے (۹ : ۴۹) میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئل ہور جمعیتِ اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے۔ ...... جمعیتِ اقوام کی تاریخ یہی ثابت کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

جنگ کی مندرجہ بالا دو صورتوں کے سوا میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا حرام ہے۔ علیٰ ہٰذا دین کی اشاعت کے لئے تلوار کبھی اٹھانا حرام ہے۔*

نشانِ ہلال نشانِ ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ یہ نشان نبی کریم صلعم اور صحابہ کے عہد میں مروج نہ تھا۔ بعض مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں اس کو تاریخ سے کوئی

---

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۲۰۴ - ۲۰۳

تعلق نہیں۔ غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو صلاح الدین ایوبی تھے، ترک نہ تھے۔ کرد تھے۔ سنی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصور کرتی ہے۔ ایران کا نشان اور ہے۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کر لیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ تاریخی پہلو سے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس کے نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند اور سورج سے اپنا سلسلہ نسب ملانے کے خیال سے۔ مگر تمام امت کا اس پر صدیوں سے اجماع ہو چکا ہے جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئیں۔ صحیح حدیث ہے کہ میری امت کا اجماع ضلالت پر نہ ہوگا۔ اس واسطے اس کو ضلالت تصور کرنا ٹھیک نہیں*

ان الارض للہ

پنجاب کے ایک مشہور پیر علامہؒ سے ملنے آئے۔ اور کہنے لگے: آج کل سرکار کی طرف سے لوگوں کو زمین مل رہی ہے مجھے بھی ایک درخواست لکھ دیجئے۔ علامہؒ نے فرمایا: آپ کو معلوم ہے، یہ درخواست کس کے نام لکھنی چاہیئے؟ وہ ذرا جھجکے۔ تو علامہؒ نے کہا: ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے قرآن۔ یہ کتاب خدا نے اپنے آخری نبی پر اتاری تھی جس

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۴۳۷،۴۳۶۔

کا نام تھا محمد۔ ان کی وفات کو تیرہ سو سال ہو گئے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اب اگر کہو تو خدا کے نام درخواست لکھ دوں۔ پیر صاحب پر ان باتوں کا اثر ہوا۔ انھوں نے کہا: خدا مالک ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔

کئی سال بعد وہی پیر صاحب علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا آپ نے مجھے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچایا اور اللہ نے مجھے زمین بخش دی۔ پوچھا وہ کیوں کر؟ پیر صاحب نے بتایا کہ میں دلی گیا تو وہاں میرے بہت سے فوجی مریدوں نے ایک دعوتِ چائے دی۔ جس میں اپنے کمان افسر کو بھی بلایا، اور آخر میں اس سے کہا کہ ہمارے پیر صاحب کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے اس لیے سرکار کی طرف سے انھیں زمین ملنی چاہیے۔ کمان افسر نے سپہ سالار کو لکھا۔ انھوں نے گورنر پنجاب سے کہہ کر پیر صاحب کو زمین دلوا دی۔*

اقبالؒ اور عمل

ایک دفعہ بلوچیوں کا ایک وفد علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ آپ کی تعلیمات نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا۔ لیکن یہی شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونۂ عمل پیش نہیں کیا۔ علامہؒ نے جواب دیا: کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے ۔۔۔۔۔۔ پھر فرمایا: دنیا میں جلیل القدر انبیاء کے سوا اور کوئی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی اصولی

---

* حیات اقبال تاج کمپنی ۱۶۰-۱۶۱

نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔*

مولوی محمد علی، ایم۔ اے کینٹب نے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا سوال کیا تھا۔ جس کا جواب علامہؒ نے یہ دیا کہ اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ہوتا، بلکہ مہدی ہوتا۔

مسولینی جن دنوں علامہؒ روما میں مقیم تھے، مسولینی نے اپنے عملے کا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ مجھ سے ملیے۔ علامہؒ تشریف لے گئے۔ دورانِ گفتگو میں مسولینی نے پوچھا میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کو ضرور اپنایا ہے۔ جسے اسلام انسانی نظام کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو آپ کو دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہوگی۔+

دورانِ گفتگو میں شہروں کا ذکر آیا تو علامہؒ نے فرمایا: ہمارے نبی کریم صلعم نے ہدایت کی تھی کہ جب مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی آبادی ایک خاص حد سے تجاوز کر جائے تو لوگ دوسرا شہر آباد کریں۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ اگر کسی شہر کی آبادی ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے تو اس کی تہذیبی قوت و اثر کے عناصر کم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کیا اچھا ہو کہ ہر شہر کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے۔ یہ سن کر مسولینی نے دونوں ہاتھ میز پر مارے۔ اور چلا کر کہنے لگا۔ واقعی یہ بہترین نظریہ ہے۔*

+ سیرتِ اقبال۔ طاہر فاروقی ۱۱۱   * روزگار فقیر

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبالؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مسولینی نے دورانِ ملاقات میں مجھ سے پوچھا افریقہ کے مسلمان مجھ سے ناخوش ہیں ان کے اطمینان کے لئے میں کیا رویہ اختیار کروں؟ میں نے اس سے کہا کہ ان سے اچھا سلوک کیجیے، اور ان کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیجیے۔ جب آپ ان کی جسمانی و روحانی آسودگی کا بندوبست کریں گے تو وہ آپ سے ناخوش نہ رہیں گے۔

مادرانہ شفقت۔ حضرت علامہ تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ ایک دن شام کے وقت وہ گھر میں گئے تو کیا دیکھا کہ والدۂ جاوید طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کر بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر علامہؒ کا دل بھر آیا اور ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: "الٰہی! اس عورت میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔" یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہٗ پیدا ہوئے۔ *

آزادیٔ نسواں ایک مرتبہ کہنے لگے کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی، وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر ضرور پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اس قدر اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہ ملے۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے، تو یہ طریق کار یقیناً غلط

---

* روزگار فقیر

ہو گا۔ مثلاً عورت جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانونِ فطری کی خلاف ورزی ہے، بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے۔ *

اسلامی شاعری ایک مقامی ہندو کالج کے چند طلبا علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: آپ سب کچھ مسلمانوں ہی کے لئے لکھتے ہیں ہمارے لئے کچھ نہیں لکھتے۔ فرمایا: تم نے میری کونسی کتاب پڑھی ہے؟ انھوں نے جواب دیا "بانگِ درا"۔ آپ نے بانگِ درا منگا کر ان سے کہا کہ اس میں سے ان نظموں کو گنو جنھیں تم خالص اسلامی کہتے ہو۔ جب انھوں نے ایسی نظمیں گنیں تو کچھ زیادہ نہ نکلیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: اب تم اپنے ظرف کا اندازہ لگاؤ۔ پھر فرمایا، یہ تو آپ کے سوال کا جواب تھا۔ اب حقیقت سنو۔ ایک شخص کی اپنی والدہ بیمار اور جاں بہ لب ہے۔ کیا اس حالت میں تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ اسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی تیمارداری میں مصروف ہو جائے؟ طلبا نے جواب دیا، ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا: میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ دوں، تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کا مترادف نہ ہو گا +

راقم الحروف (سالک) نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا اور علامہ کی خدمت میں تلمذ کے لئے عریضہ لکھا۔ جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

بے پیرا فن ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے۔

* روزگارِ فقیر۔ + راجا حسن اختر کا مضمون

اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لئے موزوں ہے تو آپ خود بخود اس پر مجبور ہوں گے۔ رہا زبان کا مسئلہ تو میں اس کے لئے موزوں استاد نہیں ہو سکتا مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیر افن ہے۔ لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لئے استعمال کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں کسی پیر استاد کی ضرورت نہیں۔ آپ کے کلام سے ہونہاری ٹپکتی ہے۔ اگر آپ کا ذوق قائم رہا تو آپ کسی دن بہت اچھے شاعر ہوں گے۔

اگر آپ شاگردی پر مصر ہی ہوں تو داغ صاحب کے شاگردوں میں دو کے نام لکھتا ہوں۔ ان سے رجوع کیجئے۔ سید محمد احسن مارہروی مارہرہ ضلع ایٹہ۔ اور منشی حیات بخش رسا، مصاحب دربار رام پور۔

اپ مفید الشعرا۔ رسالہ تذکیر و تانیث (جلال) اور تحفۃ العروض ضرور دیکھ لیجئے۔

فقیروں سے ربط

فرمایا: جن دنوں میں انار کلی میں رہتا تھا، ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں رات کے دو بجے ایک فقیر نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ علی بخش نے دروازہ کھولا۔ میں نے علی بخش سے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا ایک فقیر، آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں بستر سے اٹھا۔ فقیر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا آپ کس طرح تشریف لائے؟ کہنے لگے مجھے دوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اس لئے آپ سے ملنے آگیا۔ میں نے پوچھا آپ اس دنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگا اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آگیا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگرچہ شدت کی سردی تھی، مگر اس فقیر نے

رات کے دو بجے دہی کی لسی پینے کی خواہش ظاہر کی علی بخش گیا اور کسی دکاندار کو جگا کر لسی بنوا لایا۔ اس فقیر نے پی اور کہا اب میں چلتا ہوں میں نے کہا اسوقت تو ریل نہیں ملے گی۔ اس نے کہا فقیر کو ریل سے کیا غرض ؟

فرمایا: اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں مگر وہ آنے ہی میں نہیں آتا۔ ایک اور بزرگ لاہور میں ہوتے تھے جب کبھی ملتے۔ مہدی کے آنے کی تاریخ بتاتے وہ تاریخ گزر جاتی تو ایک نئی تاریخ مقرر کر دیتے۔ اسی انتظار میں ان کا انتقال ہو گیا۔*

ایک پیر اور مرید

ایک دن ایک مشہور پیر صاحب حضرت علامہؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ان کا ایک مرید عین دوپہر کے وقت پسینے میں شرابور ہانپتا ہوا آیا اور پیر صاحب کے قدموں پر گر گیا۔ اس نے کہا، حضور کی آمد کی اطلاع ملی تھی، صبح ہی صبح مغل پورہ سے چل دیا، کئی مقامات پر پوچھتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ میری حالت بہت خراب ہے۔ دو سو روپے کا مقروض ہو چکا ہوں۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ یہ کہہ کر دو روپے جیب سے نکال کر پیر صاحب کی نذر کیے۔ پیر صاحب نے وہ دو روپے اپنی جیب میں داخل کیے اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور مرید پر پھونک ماردی۔ وہ بیحد خوش ہوا کہ بس اب میری مشکلات کا دور ختم ہوا۔ اس کے بعد علامہؒ نے خود دعا مانگنی شروع کر دی اور کہا یا خدا! آج کے پیر گمراہ ہو گئے ہیں انھیں ہدایت دے۔ اے خدا! آج کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ پیر صاحب نے ٹوکا لیکن علامہ برابر دعا مانگتے رہے۔ الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہو گیا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ اب یہ دو سو دو

---

* ملفوظات اقبال۔ ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان

روپے کا مقروض ہو چکا ہے۔ پیر صاحب اس پر بہت برہم ہوئے۔ لیکن علامہؒ نے کہا میں تو یہ دعا اس وقت ختم کروں گا کہ آپ اس غریب کے دو روپے واپس کر دیجیے اور اس کو کہیں نوکر کرا دیجیے۔ ناچار پیر صاحب نے مرید کو دو روپے واپس کر دیے اور نوکری دلوانے کا وعدہ کیا۔*

دستِ غیب دستِ غیب کا ذکر ہو رہا تھا۔ علامہؒ نے فرمایا کہ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندرؒ نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ دوست تھا۔ ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفے کو پڑھ لینا۔ تو پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے۔ والدہ کو سارا قصہ سنایا۔ انھوں نے کہا گھر میں کچھ نہیں۔ نہ آٹا نہ دال۔ وظیفہ پڑھا گیا۔ تکیے کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ انھوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ پڑھ کر تعلیم حاصل کی۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ پڑھنا بند کر دیا۔ سرسیّد سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے سرسیّد سے کہا کہ آپ نیچری ہیں۔ مگر ہمارے وظیفے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ مجھ سے مولوی وحید الدین سلیم نے خود بیان کیا ہے کہ میرے والد کے انتقال کے بعد میری والدہ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ اور حضرت کا کھانا پکا دیا کرتی تھیں۔ ایک دن مجھے شاہ صاحب نے بلا کر کہا۔ میاں لڑکے! تم سید زادے ہو اور تم اور تمہاری

* ملفوظاتِ اقبال۔ بیان عبدالرشید طارق ۲۱۶

والدہ ہماری بہت خدمت کرتے ہو۔ آؤ تمہیں ہم ایک چیز بتائیں۔ جب کبھی تم پر ایسا وقت آئے کہ تمہارے پاس کھانے تک کو کچھ نہ ہو تو یہ کلمات پڑھ لیا کرو۔ تمہیں تکیے کے نیچے سے دس روپے مل جایا کریں گے! اور دیکھنا یہ راز کسی کو نہ بتانا ورنہ ان کلمات کا اثر معدوم ہو جائے گا اور جب تم کو حلال کی کمائی حاصل ہونے لگے تو ان کلمات کو محض حرصِ زر کی غرض سے نہ پڑھنا۔ کچھ مدت کے بعد افلاس حد سے بڑھ گیا تو میں نے ایک رات وہ کلمات پڑھے اور صبح تکیے کے تلے دس روپے مل گئے۔ ایک دفعہ اور بھی ایسی ضرورت لاحق ہوئی تو یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد چونکہ ہماری معاش کا بندوبست ہو گیا اس لئے پھر کبھی یہ کلمات پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔" مولوی وحید الدین سلیم نے یہ واقعہ سر سید کو بھی سنایا، جو ان معاملات میں بڑے سخت تیچری تھے لیکن سن کر خاموش ہو گئے۔ کچھ بولے نہیں۔

علامہؒ نے یہ بھی بتایا کہ سرسید کی طرح ان کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا کچھ علاج کیجیے۔ پیر صاحب نے کہا ذرا دکھیں۔ سر سید کے والد نے سر آگے بڑھایا۔ پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی اور سچ مچ رسولی غائب تھی*۔

دماغ اور جسم فرمایا اہلِ یورپ جن باتوں کا صدیوں تجربہ کر کے ان سے متنفر ہو چکے ہیں، یورپ کے ایشیائی مقلدین ان ہی چیزوں

* ملفوظات اقبال۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ

کے پیچھے جا رہے ہیں مثلاً آزادیٔ نسواں۔ علامہؒ نے فرمایا: مجھے عورتوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں ہے۔ یہ اپنے مشاغلِ مخصوص مثلاً خانہ داری میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں۔ پھر فرمایا عورت کو دماغ کم دیا تھا۔ اس لئے کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے اس کی تخلیقی کا کام بنا ہے! اور عورت رحم ہے۔*

جمال الدینؒ افغانی مجددؒ تھے

میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علماء یا دیگر قایدین امت کو مجدد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کو مورخین نے مہدی لکھا ہے۔ بعض علمائے امت کو امام اور مجدد کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اسمیں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ زمانہ حال میں اگر میرے نزدیک کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر۔ ایران۔ ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں موسس ہیں۔ زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انھوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا، تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہلِ بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔*

+ ملفوظاتِ اقبال۔ بیان خواجہ عبدالوحید * مکاتیب اقبال حصہ دوم ۲۳۲ - ۲۳۱

لطائف و ظرائف

چھوٹے میاں کا شعر

بعض اوقات علامہ بچوں کے ساتھ شعر میں بھی دل لگی کیا کرتے تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان ان کے نہایت عزیز دوست تھے اور وہ اکثر نواب صاحب کے ہاں جایا کرتے تھے۔ نواب زادہ خورشید علی خان ان دنوں چھوٹے سے تھے۔ کوٹھی "زرافشاں" (کوئینز روڈ لاہور) کے سبزہ زار پر یوکلپٹس کے درخت تھے۔ جن سے گوند نکلا کرتی تھی۔ نواب زادہ جن کی عمر اس وقت کوئی نو دس کی ہوگی۔ دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے۔ نواب زادہ صاحب کا بیان ہے کہ علامہ ہماری موٹر کار میں آتے اور آتے ہی مجھ کو بلاتے۔ "چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو"؟ میں کہتا "گوند نکال رہا ہوں"! تو فرماتے ع

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

میں کہتا بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر ختم ہوگئی۔ فرماتے ہاں بھئی ابھی تو ایک ہی مصرعہ ہوا ہے۔ میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں۔ دوسرا مصرعہ بھی نہیں کہہ سکتے! آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا لو چھوٹے میاں، آج ہم نے دوسرا مصرعہ بھی کہہ لیا۔

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہو گی ان کی شادی کسی نیک بخت سے*

---

* بیان نواب زادہ خورشید علی خان۔

قلندری اور سکندری

ایک دن فرمایا: چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے تہمد باندھے آگیا۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا۔ آپ کس طرح آئے؟ فقیر نے کہا: میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے کہا تمہارے علاقے کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کیا گیا ہے۔ میں نے کہا مجھے تو اس قلندری کے بارے میں اب تک کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔ میری اس بات کو بھی وہ فقیر قلندری کے کوچے کی کوئی رمز سمجھا اور چپ چاپ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین آگئے اور آتے ہی سر سکندر کے متعلق کوئی بات کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا: چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجیے۔ آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔*

علامہؒ اور جرنیل

جب جرنیل نادر خان سے علامہ اقبالؒ کی پہلی ملاقات ہوئی تو جرنیل صاحب نے بہت تعجب کا اظہار کیا۔ کہا: آپ اقبال ہیں! میں تو سمجھتا تھا کوئی لمبی ڈاڑھی والے بزرگ صورت ہوں گے۔ علامہؒ نے برجستہ جواب دیا: میں آپ سے بھی زیادہ حیران اور مایوس ہوں۔ جرنیل کے لقب سے میں تو سمجھا تھا کہ آپ بڑے ہیکل، دیو قامت آدمی ہوں گے۔ لیکن اتنا دبلا پتلا جسم تو جرنیل کے شایان شان نہیں ہوتا۔+

---

* ملفوظات اقبال۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ۔

+ " " " "

وطن کی بہنیں اخبار "وطن" کے ایڈیٹر مولوی انشاءاللہ خاں علامہؒ کے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ ان دنوں علامہ انارکلی بازار میں رہتے تھے اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں میونسپل کمیٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی۔ چنانچہ انھیں وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاءاللہ کئی مرتبہ علامہؒ سے ملنے گئے۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہؒ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن علامہ گھر پر مل گئے۔ مولوی صاحب نے مزاحاً کہا۔ ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انارکلی بازار سے اٹھوا دی گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ علامہؒ نے جواب دیا: "مولوی صاحب کیا کیا جائے وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہیں"۔ مولوی صاحب کٹ گئے۔*

مصلح موعود ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا ہے۔ ایک دن علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا مجھ سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے۔ علامہؒ ہنس کر کہنے لگے، خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو۔ وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو پایہ تخت بناؤں گا۔ علامہؒ فرمانے لگے: "ہم تو غالباً اس وقت موجود نہ ہوں گے۔ البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اسے ضرور بخش دینا"۔

علامہؒ کے مرض الموت میں یہ شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا۔ آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔ علامہؒ ہنسے اور کہنے لگے۔ واہ ہم اور آپ کو نہ پہچانیں!

---

* روزگار فقیر۔

ولی را ولی می‌شناسد*

برداشت احسان

علامہ اپنے استاد مولوی میر حسن شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی شعر سنانے کی جرأت بھی نہ کی۔ فرماتے ہیں: "زندگی بھر شاہ صاحب کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرعہ نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقی طور پر۔ مولوی صاحب کسی کام کیلئے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ مولوی صاحب نے فرمایا: اقبال اسے گود میں اٹھالو۔ میں نے اسے اٹھا تو لیا، مگر تھوڑی دور جا کر تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو ایک دکان کے "تختے" پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب بہت آگے نکل گئے۔ مجھے ساتھ نہ پایا تو لوٹے اور میرے قریب آکر فرمایا: اقبال اس کی برداشت بھی دشوار ہے؟ میری زبان سے بے اختیار نکلا... "تیرا احسان بہت بھاری ہے": +

کتے نہیں آدمی

فقیر سید وحید الدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر علامہ رح سے ملنے آئے۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ علامہ کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد علامہ کی ننھی بچی منیرہ بھاگی ہوئی آئی اور کہنے لگی: ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں۔ علامہ رح نے ان حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا: نہیں بیٹیا یہ تو

---

* راجا حسن اختر + روزگار فقیر

آدمی ہیں۔*

کاڈلیور آئل یہ سب کو معلوم ہے کہ لارڈ کچنر جس جہاز میں آخری سفر کر رہے تھے، وہ غرق ہو گیا تھا۔ اور ان کی نعش بھی نہ ملی تھی۔ اس زمانے میں ایک افواہ اڑی کہ لارڈ کچنر بچائے گئے ہیں۔ ایک دوست نے علامہؒ سے ذکر کیا کہ سنا ہے لارڈ کچنر زندہ ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا، ہاں۔ کاڈلیور آئل کی صورت میں واپس آگیا ہو تو تعجب نہیں۔

چودھری شہاب الدّین پنجاب کے جلیل القدر ارباب سیاست میں چودھری سر شہاب الدّین کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ آپ بڑے قابل وکیل اور نہایت کامیاب صدر مجلس قانون ساز تھے۔ علامہ اقبالؒ سے پرانی دوستی تھی۔ رنگ کالا تھا۔ نہایت گراں ڈیل اور بالا بلند آدمی تھے۔ اور کھانے پینے میں دُور دُور تک اپنا حریف نہ رکھتے تھے۔ علامہ قریب قریب ہر ملاقات میں ان پر ایک آدھ پھبتی کہہ دیتے۔ اور اگر وہ بُرا مانتے تو کہتے کہ تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے مجھے پھبتی سے نہ روکا کرو۔

ایک دن چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے بار روم میں آگئے۔ علامہ نے دیکھا تو چونک کر بولے: ہائیں چودھری صاحب ننگے ہی چلے آئے؟

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ چودھری صاحب اور علامہ دونوں موجود تھے۔ چودھری صاحب نے از سرتاپا سفید لباس

---

* بیان مرزا جلال الدین

پہن رکھا تھا۔ علامہؒ نے بے اختیار پنجابی میں کہا: "او دیکھو۔ کپاہ وچ کٹا وڑ گیا!" (یعنی دیکھنا کپاس کے کھیت میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا)۔

ایک دن چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار پارٹی تھی۔ چودھری صاحب نے پانی مانگا۔ علامہؒ نے آدمی کو پکار کر کہا۔ "دیکھو بھئی۔ چودھری صاحب کے لیے بالٹی میں پانی لانا۔"

چودھری صاحب نے اپنی عالی شان کوٹھی بنائی۔ جو اپنی وسعت و عظمت اور بلندی میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ علامہ سے کہا اس کوٹھی کا نام سوچیا۔ انھوں نے کہا سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ "دیو محل رکھ دو۔"

چودھری شہاب الدین اپنی قانونی و انتظامی قابلیت اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بلدیہ لاہور کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس زمانے کا ذکر ہے۔ سر شجاع الملک مہتر چترال اول لاہور تشریف لائے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ہاں پرتکلف دعوت دی گئی اور نواب صاحب نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ آپ ہز ہائینس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجیے۔ علامہ اقبال تعارف کرانے لگے۔ جب چودھری صاحب کی باری آئی تو کہا اعلیٰ حضرت! ایں خان بہادر چودھری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور ہستند۔ گویا کہ مہتر لاہور می باشند۔ مجلس میں ایک قہقہہ لگا۔ چودھری صاحب جل کر کوئلہ ہو گئے۔ مہتر صاحب کچھ نہ سمجھے اور علامہؒ کا لطیفہ کامیاب رہا۔

چھٹا باب

اقبالؒ کے استادِ محترم

حضرت مولانا حافظ سید میر حسن شاہؒ

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہو
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

گزشتہ صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کے مسلم معاشرے پر یاس و حرماں کی جو کیفیت طاری تھی اس کا صحیح اندازہ کرنا بے حد دشوار ہے۔ ہزار سال کی جمی ہوئی مسلم حکومت افسانۂ پارینہ ہو چکی تھی مسلمان دس صدیوں کی آفاقی و خسروی سے محروم ہو کر غلام و محکوم ہو چکے تھے۔ شرفا کے بڑے بڑے خاندان تباہ اور تہذیب کے بڑے بڑے مرکز ویران ہو چکے تھے۔ زوال و انحطاط کے زمانے میں مسلمانوں نے علم و تعلیم سے جو غفلت اختیار کی تھی، اس کے اثرات قوم کی ثقافتی و اخلاقی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے۔ پرانے علوم کی

افادی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور علوم جدید مسلمانوں کے لیے علما کے فتوے کے
ماتحت شجر ممنوعہ قرار دیئے جا رہے تھے۔ ملائیت کے جمود نے اسلام کو ایک تیرہ و
تار ظلمت کدہ بنا رکھا تھا اور نام نہاد روشن خیالی خود مذہب ہی کے بند ھنوں
سے آزاد ہو رہی تھی۔ انگریز قوم نے ہندوستان کی اس صورتِ حال کو دین مسیحی
کی ترویج و تبلیغ کے لئے نہایت موافق پایا۔ پادریوں کی ایک فوج ملک کے
گوشے گوشے میں پھیل گئی اور ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی متاعِ
ایمان پر ڈاکے ڈالنے لگی۔ ثقافتِ اسلامی اور فکرِ اسلامی کے زاوے سنسان ہو رہے
تھے اور مسلم معاشرے کا جہاز بادِ مخالف کے جھونکوں اور طوفان انقلاب کی موجوں
کے تھپیڑوں سے بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ جن لوگوں کے پاس بزرگوں کے ترکے میں
کچھ دولت موجود تھی، وہ شراب خوری اور عیاشی میں مستغرق تھے۔ جائدادیں
خالصے لگ رہی تھیں اور امیروں اور شریفوں کی اولاد کے لئے اس کے سوا
کوئی شغل باقی نہ رہا تھا کہ جلسہ ہائے منعقد کریں طوائفوں سے داغ کی غزلیں
سنیں اور مصاحبین کی خوشامد درآمد کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حالت میں
بھی دربارِ مغلیہ کے امرا کے ہم پلہ سمجھتے رہیں۔ نوجوانوں کے عقاید نہایت سرعت
سے بگڑ رہے تھے۔ مسیحیوں نے اسلام پر ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی جن
کا جواب ان نوجوانوں سے ہرگز ممکن نہ تھا۔ جو اپنے دین سے بالکل بے بہرہ تھے
اور نہیں جانتے تھے کہ جس اسلام پر مخالفین حملے کر رہے تھے وہ اصلی اسلام نہ تھا
بلکہ محض ملا کا اسلام تھا۔ چنانچہ بے شمار نوجوان اسلام کی طرف سے بدعقیدہ
اور بے زار ہو گئے، اور مسیحی مذہب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ بسترِ تیرے

مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے غیر مذاہب کے اعتراضات کا مقابلہ کرنے کے لیے عقلی بنیادوں پر مسلمات اسلامی کی تعبیر و توجیہ کی اور نوجوانوں کو ارتداد سے بچا لیا۔

سرسید کی تحریک اور ان کی دینی مساعی کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ بڑی حد تک ارتداد کا انسداد ہو گیا لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بے خبری کا عالم وہی رہا۔ وہ روز بروز دین سے علحدہ ہوتے گئے اور صرف دنیاوی معاملات میں مسلمان رہ گئے۔ یہی کیفیت تھی جس سے متاثر ہو کر بعض علمائے دین نے علوم دینیہ کے مراکز قائم کیے۔ لیکن اس دو عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نوجوان دو کیمپوں میں بٹ گئے۔ دیوبند کے طلبا کو دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا اور علی گڑھ کے نوجوانوں کو دین سے کوئی سروکار نہ رہا لیکن اس پر آشوب زمانے میں بھی بعض گوشوں کے اندر ایسے منور الفکر اہل علم موجود تھے جو مصالح دین اور مصالح دنیا دونوں کو مدنظر رکھ کر بعض مسلمان بچوں کی تربیت کر رہے تھے۔ اقبال انھیں بچوں میں سے تھے جن کو مولا سید میر حسن شاہ جیسا مجمع البحرین استاد مل گیا اور اسی استاد نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا۔ اگر اقبال کو بچپن ہی میں شاہ صاحب کے آگے زانوے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی اور وہ ایک عام مسلمان لڑکے کی طرح چرچ مشن ہائی سکول اور مرے کالج سیال کوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے پڑھ پڑھا کر ایم۔ اے کر لیتے تو اپنی ذہانت و طباعی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو جاتے۔ اور نوکری نہ کرتے تو وکیل بن جاتے۔ پھر ہمارے بعض بڑے بڑے وکیلوں کی طرح روپیہ جمع کر کے فوت ہو جاتے۔ اور آج ان کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔

لیکن قدرت یہ منظور نہ تھا کہ یہ نابغہ یوں رائیگاں ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کے اثر سے اقبالؒ کی فطری ودیعتوں کو جلا نصیب ہوئی اور علوم جدیدہ کے علاوہ علوم اسلامی اور عرفان تصوف کے اسرار و معارف بھی ان پر کھل گئے۔ چونکہ اقبال کے والدِ محترم کا میلان دین اور تصوف کی طرف تھا اس لیے وہ سیال کوٹ کے ایک مشہور عالم دین مولانا غلام حسن کی مجلس میں استماع معارف دینیہ کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بچے کو صرف علوم دین پڑھائیں گے۔ چنانچہ اقبال مولانا غلام حسن کے ہاں پڑھنے بٹھا دیئے گئے۔ مولانا سید میر حسن شاہ صرف عالم دین ہی نہ تھے، بلکہ ادبیات، لسانیات، ریاضیات اور تفسیر قرآن کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اقبال کو وہاں دیکھ کر اور اس کی شکل صورت اور ذہانت سے متاثر ہو کر پوچھا: یہ کس کا بچہ ہے؟ جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے تو انھوں نے خود شیخ صاحب سے کہا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ اسے میں پڑھاؤں گا۔ چنانچہ اقبال شاہ صاحب کے سپرد ہو گئے اور اس تعلق کا آغاز ہوا جو مدت العمر قائم رہا۔

حضرت شاہ صاحب نے کچھ شیخ نور محمد کی وجہ سے اور کچھ اقبال کی طباعی اور ہونہاری کے باعث ان کی تعلیم و تدریس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ اس زمانے کا عام معمول یہ تھا کہ اس قسم کے معلمین بچوں کو گلستاں۔ بوستاں۔ سکندر نامہ۔ یوسف زلیخا۔ جامی۔ انوار سہیلی۔ صرف بہائی۔ صرفِ میر۔ ہدایت النحو، کافیہ۔ کنز الدقائق۔ قدوری وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے ہاں بھی

یہی قاعدہ تھا لیکن ان کے اسلوب تدریس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض زبانی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اپنے طلبا میں فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ فارسی کا ایک شعر پڑھاتے تو اس کے مترادف اشعار اردو اور پنجابی میں پڑھ دیتے اور اس وقت تک سمجھاتے رہتے جب تک اس کا مطلب پوری طرح طالب علم کے ذہن نشین نہ ہو جاتا۔ انھیں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موقع پر انھیں برمحل اشعار فوراً یاد آجاتے۔ انہیں کسی تکلف و تردد کی ضرورت نہ پڑتی۔ کچھ مدت تک اقبال صرف شاہ صاحب سے پڑھتے رہے۔ آخر شاہ صاحب ہی نے ان کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا جس میں وہ خود مدرس مقرر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں شاہ صاحب کو چالیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے بعد معمول یہ ہو گیا کہ اقبال مدرسے میں تو عام کورس پڑھتے لیکن وہاں سے واپس آکر انہی تدریسات میں مصروف ہو جاتے جو شاہ صاحب نے شروع کرا رکھی تھیں۔ اور یہ سلسلہ اسوقت تک نہایت باقاعدگی سے جاری رہا جب وہ سکاچ مشن کالج سے ایف۔ اے پاس کر کے مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے آئے۔

چونکہ شاہ صاحب نے سالہا سال تک اقبال کو عربی۔ فارسی، علم و حکمت، ادبیات، تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کو صحیح راستے پر لگا دیا تھا اور ان میں علوم قدیمہ و اسلامیہ کے لئے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی، اس لئے اقبال جب کبھی موقع پاتے، سیالکوٹ آکر شاہ صاحب سے اپنے شکوک رفع کراتے۔ مزید

سبق لیتے۔ اور غوامض علوم پر اپنے استاد کی ہدایت و رہنمائی سے غور و فکر کرتے۔

حضرت شاہ صاحب کی علمی معلومات بیحد وسیع تھیں اور بیہودہ تعلیمی و تدریسی مصروفیتوں کے باوجود مسلسل و متواتر مطالعہ بھی کرتے رہتے۔ جہاں کہیں کوئی نایاب یا کمیاب کتاب پاتے اور اس کو خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی تو اسے نقل کر لیتے اور علمی کتابوں کی نقلیں تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے بیشمار کی ہونگی۔ ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ اقبال لاہور میں پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں کہیں سیالکوٹ جانا ہوا تو کیا دیکھتے ہیں، کہ شاہ صاحب فلوگل کی نجوم الفرقان کی نقل کر رہے ہیں۔ پوچھا حضرت آپ اس مطبوعہ اور ضخیم کتاب کو نقل کرنے کی زحمت کیوں فرما رہے ہیں؟ جواب دیا۔ اس کتاب کی قیمت چھبیس روپے ہے اور مجھ میں قدرت نہیں ہے۔ اقبالؒ نے اسی وقت نجوم الفرقان خرید کر نذر کی۔

ابھی شاہ صاحب کا عالم شباب ہی تھا کہ ان کی ہمشیر سخت بیمار ہوگئیں یہاں تک کہ بچنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ ایک دن شاہ صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ آبدیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بس اب میں مرجاؤں گی اور کوئی میری قبر پر بھی نہ آئیگا۔ شاہ صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے۔ اور فرمایا اللہ تمہیں شفا دے لیکن اگر کوئی حرج مرج ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جیوں گا روزانہ تمہاری قبر پر آیا کروں گا ہمشیر کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا اور شاہ صاحب کی بینائی ۱۹۲۸ء یعنی انتقال سے کوئی دو سال پہلے زائل ہو گئی۔ اس پچاس سال کی مدت میں ان کا مستقل معمول یہ رہا کہ روزانہ صبح کے وقت ہمشیر کی

قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے۔ تہجد اور نماز فجر کے بعد وہ قبرستان جاتے۔ اور آتے جاتے ہوئے بھی بعض شاگردوں کو سبق دیتے جاتے۔ سوائے ان دنوں کے کہ شاہ صاحب کو سیالکوٹ ہی سے باہر جانا پڑا ہو۔ اس معمول میں ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا۔

حضرت شاہ صاحب نہایت راسخ الاعتقاد اور عبادت گزار مسلمان بزرگ تھے لیکن ان کی وسیع المشربی مسلم تھی۔ عمر بھر کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا تو یہی کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کے علاوہ بیشمار ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ان کے شاگرد تھے۔ اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے عہدوں اور رتبوں پر پہنچے۔ لیکن ادب واحترام کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کی جوتیاں ان کے آگے رکھتے اور رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب کی طرف پشت نہ کرتے تھے۔ بلکہ دروازے تک پچھلے پاؤں چل کر جاتے۔ شاہ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہایت معمولی لیکن صاف ستھرا لباس پہنتے اور بیحد مستغنی آدمی تھے۔ بارہا صوبے کے بڑے بڑے کالجوں سے ان کو پروفیسری کی پیش کش ہوئی۔ لیکن ان کی قناعت نے انھیں چرچ مشن کالج ہی سے وابستہ رکھا۔ جہاں ان کی تنخواہ تا دم آخر ایک سو بیس روپے سے متجاوز نہ ہونے پائی۔ اقبال کی سادگی اور ان کی قناعت اور ان کا استغنا مسلم ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے استغنا بھی شاہ صاحب ہی سے سیکھا ہے۔

سرسید احمد خاں کو پنجاب میں جن دو چار بزرگوں پر پورا اعتماد تھا اور جن کا وہ بیحد احترام کرتے تھے، ان میں شاہ صاحب کا نام نہایت ممتاز ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں باقاعدہ شامل ہوتے۔ ۱۸۷۳ء میں سرسید

سے شاہ صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی۔ جب شاہ صاحب کی عمر بمشکل تیس برس کی ہو گی۔ یہ ملاقات پنجاب ہی میں ہوئی تھی۔ کیونکہ سرسید اپنے دورے پر یہاں آئے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں جب علی گڈھ کالج کا سنگِ بنیاد وائسرائے نے رکھا اس تقریب میں شاہ صاحب بھی شریک تھے۔ سرسید نے وائسرائے کے اعزاز میں نہایت بڑا ڈنر دیا۔ شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سرسید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا نہ کھالیں ان کی خدمت میں حاضر رہنا اور ان کی باتیں سننا۔

۱۸۹۵ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ شاہ صاحب کے پاس ممبری کا ٹکٹ تھا۔ جو اتفاق سے گم ہو گیا۔ دروازے پر رضاکاروں نے روک دیا۔ اتنے میں محسن الملک کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے رضاکاروں کو پکار کر کہا کیا غضب کرتے ہو۔ ایسے بزرگ کو روکتے ہو جس نے یہ کانفرنس قائم کی ہے!

سرسید کی وفات کا تار ملا تو شاہ صاحب کالج جا رہے تھے۔ راستے میں اقبال مل گئے۔ ان سے کہا کہ سرسید فوت ہو گئے ہیں۔ مادۂ تاریخ کے لیے فکر کرنا۔ اقبال ایک دوست کی دکان پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب کے فرزند سید ذکی شاہ سے کہنے لگے: تاریخ کا مادہ نکل آیا ہے۔ ابھی کالج جا کر شاہ صاحب کو سنا دو۔ مادہ تھا: انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک۔ سید ذکی شاہ نے یہ مادہ شاہ صاحب کو سنایا تو فرمانے لگے بہت خوب ہے۔ لیکن میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے، اور وہ ہے "غفرلہ"۔ مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" میں دونوں تاریخوں کا ذکر تھا لیکن نام کسی کا نہ تھا۔ شاہ صاحب نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا اور ناموں

کے درج نہ کرنے کی شکایت کی۔ حالی نے جواب میں لکھا: مجھے ناموں کا علم نہیں تھا۔ آئندہ ایڈیشن میں اس فروگزاشت کی تلافی کر دی جائے گی۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور مولوی حکیم نورالدین بھی شاہ صاحب کی بے حد عزت کرتے تھے اور مرزا صاحب تو ایک مدت تک سیالکوٹ میں رہ بھی چکے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب کے داماد سید خورشید انور بعارضہ دق بیمار ہوگئے۔ شاہ صاحب انھیں قادیان لے گئے۔ تاکہ حکیم نورالدین سے علاج کرائیں قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے۔ لوگ ان کو جانتے نہ تھے۔ انھوں نے انھیں وہاں سے اٹھا دیا۔ لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے۔ مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولی جواب دے کر بیٹھ گئے، اور متوجہ نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ مرزا صاحب نے غور سے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ۔ دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی حسب خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے۔ دوسرے انھیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں۔ ساتھ ہی کہا صبح چائے میرے ساتھ پئیں۔ بہت خاطر تواضع کی اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک یکے کے ساتھ ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر باتیں سنیں۔ بعد میں مفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ نہ

شاہ صاحب ہی نہ بیان کیا۔

شاہ صاحب کے معمولات کی کیفیت یہ تھی کہ نمازِ تہجد اور نماز فجر سے فارغ ہو کر قبرستان جاتے ہمشیر اور اپنے احباب کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ ساڑھے سات بجے کے قریب واپس آتے۔ راستے میں بعض شاگردوں کو سبق دیتے۔ اور گھر پہنچ کر پھر تدریس میں مصروف ہو جاتے۔ کالج کے وقت سے پہلے جلدی جلدی کھانا کھاتے۔ اور کالج کو چل دیتے۔ یہاں بھی راستے میں شاگرد ساتھ لگے رہتے۔ دن بھر کالج میں پڑھاتے، واپس آتے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گھر کا سودا بازار سے خود لایا کرتے تھے۔ اس آمد و رفت میں بھی شاگرد پیچھا نہ چھوڑتے اور سبق کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پاتا۔ ہر آٹھویں دن ایک روپیہ بھناتے اور دو دو پیسے بچوں میں تقسیم کر دیتے۔ قرآن کریم سے بیحد شغف تھا۔ حافظ بھی تھے۔ ایک منزل روز ختم کرتے۔ تہجد میں ایک پارہ روزانہ پڑھتے۔ مولانا عبدالکریم سیال کوٹی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ قرار پایا کہ ایک ہی شب کی تراویح میں پورا قرآن ختم کیا جائے۔ حافظ نے پڑھنا شروع کیا بعض مقتدی تو تین تین چار چار پاروں ہی میں بیٹھ گئے۔ میں بھی بمشکل اٹھارہ پارے کھڑے ہو کر سن سکا لیکن شاہ صاحب پورا قرآن تراویح میں کھڑے ہو کر سنا۔ قرآن سے یہ شیفتگی اور یہ قوتِ برداشت عدیم المثال ہے۔ اسی بیاسی برس کی عمر میں بھی فرض سنت اور نفل کھڑے ہو کر ہی پڑھتے رہے۔

سکاچ مشن سکول اور اس کے بعد کالج میں شاہ صاحب برابر پڑھاتے رہے۔ اس درسگاہ کے انگریز پرنسپل ہمیشہ شاہ صاحب کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ کالج ٹائم ٹیبل مرتب کیا جاتا تو پرنسپل یہ تاکید کرتا کہ پہلے شاہ صاحب سے

پوچھو۔ اگر انھیں نئے ٹائم ٹیبل میں کوئی دقت معلوم ہو تو ان کی سہولت کے مطابق بدل دو۔ ایک دفعہ شاہ صاحب بیمار تھے، یکم اپریل کو کسی طالب علم نے پرنسپل سے جاکر کہہ دیا کہ شاہ صاحب فوت ہو گئے۔ پرنسپل گیرٹ بھاگا ہوا شاہ صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو صحیح سلامت پاکر قصہ سنایا۔ اس کے بعد واپس آکر اس طالب علم کو سکول سے خارج کر دیا اور کہا کہ "اپریل فول" ہی مقصود تھا تو شاہ صاحب کے متعلق ایسی اطلاع کیوں دی؟ پرنسپل گیرٹ بہت کنجوس مشہور تھا لیکن جب شاہ صاحب کی آنکھوں کا اپریشن ہوا اور کالج جانا مستقل طور پر بند ہو گیا تو اس نے شاہ صاحب کی پوری تنخواہ پنشن کے طور پر مقرر کر دی۔ تنخواہوں کے رجسٹر میں بطور اعزاز سب سے اول شاہ صاحب کا نام لکھا جاتا۔ پرنسپل بھی اپنا نام شاہ صاحب کے بعد درج کرتا۔ جب تک شاہ صاحب زندہ رہے، کالج سے ان کو پوری تنخواہ پنشن کے طور پر ملتی رہی۔ بلکہ بطور اعزاز کالج کے ہال کا نام بھی میر حسن ہال رکھ دیا گیا۔

شاہ صاحب کی غریب پروری ضرب المثل بن گئی تھی۔ مثلاً چند واقعات سنیئے۔ سیالکوٹ میں کشمیریوں کا ایک غریب لڑکا غلام محمد تھا جس کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا کیونکہ اس کے والدین بالکل بے استطاعت تھے۔ شاہ صاحب نے اس کی تعلیم کا بار اٹھا لیا اس کی فیس معاف کرائی اور اس کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ یہاں تک کہ یہی غلام محمد پنجاب کا کامیاب ترین ہیڈ ماسٹر تسلیم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحمید بٹ سابق ڈائرکٹر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ انہی غلام محمد کے صاحبزادے تھے۔ ماسٹر غلام محمد نہایت قابل اور دردمند مسلمان تھے۔ راقم کتاب کے پاس اکثر تشریف لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بدحالی کے ذکر پر نہایت دردمندانہ

آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ اور مولوی میر حسن کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے تو کبھی نہ تھکتے تھے۔

ایک غیر مسلم دھوبن شاہ صاحب کے کپڑے دھویا کرتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا ساتھ آیا کرتا تھا۔ شاہ صاحب نے اس لڑکے کو پڑھانا شروع کیا۔ جب وہ ذرا سیانا ہوا تو مسلمان ہو گیا۔ رکن الدین نام رکھا گیا۔ شاہ صاحب نے اس کو پوری تعلیم دلوائی۔ ایک اور شاگرد نہال سنگھ رکن الدین کا ہم سبق تھا۔ دونوں میٹرک سے ایم۔ اے تک اول دوم آتے رہے۔ رکن الدین سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوئے اور نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر بن گئے اور سبکدوش ہونے کے بعد پٹیالہ میں وزیر ہوئے۔ رکن الدین حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں مریدوں کی طرح حاضر ہوتے اور بوقت رخصت پچھلے پاؤں چل کر دروازے تک پہنچتے۔ نہال سنگھ راستے میں شاہ صاحب کو دیکھ پاتا تو گاڑی سے اتر آتا اور ادب سے شاہ کے پیچھے پیدل چلتا۔

ایک اور واقعہ سنیئے: ہنگامہ سن ستاون کے کئی سال بعد ایک سید نوجوان احمد شفیع نہایت بدحالی میں سیالکوٹ پہنچے۔ وہ اپنے والد اور بھائی سے الگ ہو چکے تھے۔ گزر بسر کا کوئی سہارا نہ تھا۔ پہلے دس روپے ماہوار پر نوکر ہوئے پھر شاہ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ پھر محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر محکمہ مال میں سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ خوب ترقی کی یہاں تک کہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ یہ وہی سید احمد شفیع ہیں جن کی صاحبزادی محمدی بیگم سے شمس العلما مولوی ممتاز علی کی شادی ہوئی۔ گویا یہ ہمارے سید امتیاز علی تاج

کے نانا تھے۔

شاہ صاحب کے ہشیار شاگردوں میں علامہ اقبالؒ کے علاوہ جو حضرات ممتاز تھے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: نامور عالم مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مشہور مؤرخ منشی غلام قادر فصیح، مولوی احمد دین ریڈر اور ان کے فرزند محمد مسیح پال یعنی ائین حزیں، مولوی ظفر اقبال پی ای ایس ریٹائرڈ، عبدالقیوم پی ای ایس ریٹائرڈ، لالہ بھیم سین اور ان کے صاحبزادے جسٹس کنور سین سابق پرنسپل لاکالج، لاہور، مشہور سکھ لیڈر سردار کھڑک سنگھ، سردار حضورا سنگھ وکیل، پنڈت بیلی رام وکیل، لالہ نرنجن داس جج، رکن الدین سیشن جج، نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر، شیخ ظہور الدین تحصیلدار، سردار جرت سنگھ ڈسٹرکٹ جج، ماسٹر غلام محمد، ڈاکٹر جمشید علی راٹھور اور ہشیار دوسرے حضرات۔

لطف یہ ہے کہ شاہ صاحب نے مبتدیوں سے لے کر منتہیوں تک سب کو پڑھایا اور کسی سے کوئی حق الخدمت وصول نہ کیا۔ گھر پر جو طلبا پڑھنے آتے ان کی خدمت خود کرتے۔ کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے۔ پروفیسر جمشید علی راٹھور اور ماسٹر غلام محمد نے ذاتی اعتبار سے شاہ صاحب کی بہت خدمت کی۔ ان کے سوا شاہ صاحب نے کسی کو ذاتی خدمت لینے کی تکلیف نہ دی۔ عام طور پر اردو میں بات چیت کرتے۔ زبان بہت صحیح اور سلجھی ہوئی تھی۔ اخلاق مجسم تھے۔ سادگی، سنجیدگی، تواضع، احسان مندی طبیعت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ بیحد ذہین وطباع تھے اور حافظہ حیرت انگیز طور پر قوی تھا۔ علامہ اقبالؒ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ شاہ صاحب کی صحبت سے اطمینان خاطر پیدا ہوتا

تھا اور فکرمندی دور ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں ایک صوفی بزرگ کبیر شاہ تھے۔ شاہ صاحب اور شیخ نور محمد (والد اقبال) کو ان سے بےحد عقیدت تھی۔ حافظ عبدالمنان محدث وزیرآبادی کے ساتھ خصوصیت سے ارادت تھی۔ یعنی شاہ صاحب ہر فرقہ کے بزرگ کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے اور اس معاملے میں نہایت وسیع المشرب واقع ہوئے تھے۔

مولانا ظفر اقبال فرماتے ہیں: جب میں لاہور میں تعلیم پاتا تھا تو ایک مرتبہ یونیورسٹی کے کسی امتحان کے پرچے مولانا میر حسن کے پاس تھے۔ میرے ایک استاد نے کسی طالب علم کے پرچے کے لئے شاہ صاحب کے پاس بھیجا اور تاکید کی کہ اس طالب علم کو اچھے نمبر دے دیئے جائیں۔ مجھے شاہ صاحب کی روش کا علم تھا۔ لیکن استاد کے حکم سے مجبور ہو کر گیا۔ وہاں پہنچ کر شاہ صاحب سے گزارش کی کہ میں اپنے ایک استاد کا پیغام آپ کو پہنچانا چاہتا ہوں۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ شاہ صاحب نے پیغام سن کر فرمایا: یہ لوگ دین اور دنیا کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے، پیغام مل گیا میں خوب غور کروں گا۔ پھر پرچہ دیکھوں گا۔ اگر گنجائش ہوئی تو ضرور نمبر دوں گا۔ لیکن مولانا روم کے قول کے مطابق لقمہ ہی دیا جا سکتا ہے حلق بنا کر نہیں دیا جا سکتا۔ یونیورسٹی سے ہمارا جو معاہدہ ہے، اس کی پابندی نہ ہو تو جو کچھ ملتا ہے، وہ حلال نہ رہے۔ حرام ہو جائے۔

شاہ صاحب مہذب ظرافت اور نکتہ سنجی میں بھی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اب میں چند لطائف عرض کروں گا جن سے آپ حضرات کو شاہ صاحب کی شگفتگی طبع کا اندازہ ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اقبال کی خوش طبعی بھی شاہ صاحب ہی

کے مزاج کی پیداوار ہے۔

قادیان کے مولوی حکیم نورالدین جموں میں رہتے تھے اور اکثر شاہ صاحب سے ملنے سیال کوٹ آجایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب ان کی مشایعت کو کے لیے جا رہے تھے۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں حکیم نورالدین نسبتاً فاروقی تھے، اور شاہ صاحب سید۔ حکیم صاحب نے کہا کہ یہ ہمارے ہی بزرگ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے حضور سرورِ کائنات سے صاف کہہ دیا کہ "حسبنا کتاب اللہ" اس پر شاہ صاحب نے جھک کر فرمایا کہ یہ قول بھی تو حضرت عمرؓ ہی کا ہے۔ کہ "لولا علی لھلک عمر" (اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گیا ہوتا)۔

ساگر چند ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا جس کا رنگ بہت سیاہ تھا۔ ایک دن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ شاہ صاحب سے کہنے لگا۔ دیکھیے موسم کتنا اچھا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ بھی تو کالی گھٹا بن کر آگئے ہیں!

اس زمانے میں نائٹ اسکول بھی ہوتے تھے جن میں بالغوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک موقع پر حروف ابجد تختۂ سیاہ پر لکھے گئے اور ایک شخص سے پوچھا گیا "بھائی لام بتا"۔ تو اس نے ق پر انگلی رکھ دی۔ دوسرے سے پوچھا، تو میم بتا۔ اس نے ی پر انگلی رکھ دی۔ شاہ صاحب نے فرمایا، شاباش شاباش۔ کسی نے پوچھا حضرت یہ شاباش کا کون سا موقع ہے؟ کہنے لگے: انھیں کم از کم اتنا تو معلوم ہے کہ ل۔ م۔ ص اور ی حروف ہیں۔

ایک روز بازار گئے۔ میوہ فروش کی دکان سے گذرے۔ اس نے کہا:

شاہ صاحب سردا بہت اچھا ہے، لے لیجیے۔ پوچھا بھئی بھاؤ کیا ہے۔ اس نے کہا آٹھ آنے سیر۔ پنجابی میں کہنے لگے۔ سردا تو اچھا ہے پر مینوں نہیں سردا۔

شاہ صاحب کے چچیرے بھائی حکیم حسام الدین ان سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے اور بڑے سخت مزاج اور درشت طبیعت تھے۔ یہ احمدی ہو گئے تھے۔ میر حسام الدین مرزا صاحب کی ایک دو کتابیں لے کر شاہ صاحب کے پاس گئے اور کچھ عبارتیں دکھا کر بولے، کہو مسیح فوت ہو گیا یا نہیں؟ شاہ صاحب نے کہا۔ فوت ہو گیا ہو گا۔ میر حسام الدین کہنے لگے "پھر آئیگا؟" شاہ صاحب نے کہا۔ میر فیض اللہ* مر کر واپس آئے ہیں؟ میر حسام الدین بے اختیار بولے "بے ایمان۔ کافر۔ منکر خدا و رسول!" یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ ایک دن میر حسام الدین اپنے مکان کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ شاہ صاحب آ گئے۔ میر صاحب نے پوچھا۔ کون؟ شاہ صاحب نے کہا "وہی بے ایمان۔ کافر منکرِ خدا و رسول" میر حسام الدین نے یہ سنتے ہی جوشِ محبت سے گلے لگا لیا اور کہنے لگے "بھیا۔ تمہاری انہی باتوں نے تو ہمیں مار رکھا ہے"!

اس زمانے میں ایک شاعر منشی میراں بخش جلوہ سیالکوٹی تھے۔ جو اکثر انجمن حمایت اسلام میں بھی آکر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ذات کے قصاب تھے۔ عرضی نویسی کرتے تھے۔ خدا جانے کہاں سے شعر کہنے کی لت پڑ گئی۔ شعر کیا تھے، بس پکوڑے سے تل لیا کرتے تھے۔ ان دنوں خزانے کے ایک کلرک اہل زبان تھے۔ جلوہ صاحب ان کو اکثر شعر سنایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے تنگ آ کر کہا۔ بھائی جلوہ تمہارے شعروں سے چھیچھڑوں کی بو آتی ہے۔ جلوہ صاحب تاؤ کھا کر شاہ صاحب کی

* میر حسام الدین کے والد

خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ان کو اپنے اشعار سنا کر پوچھا کہ یہ اشعار کیسے ہیں؛ شاہ صاحب نے فرمایا سچ پوچھتے ہو تو تم نے ان اشعار کا جھٹکا کر دیا ہے۔

ایک دفعہ مولوی حکیم نورالدین نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ میری تحریروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ مزاحًا کہنے لگے کہ آپ کا کیا ہے۔ آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دیتے۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر اپنی جیب سے نکال کر ایک کارڈ پیش کیا اور کہا کہ یہ میرے پاس آپ کا ایک خط ہے۔ میں نے آپ سے دوا پوچھی! آپ نے دوا لکھ بھیجی لیکن یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں۔ سونگھوں۔ گھس کر لگاؤں گھوٹ کر پیوں۔ کیا کروں۔ نہ وزن لکھا۔ کہ رتی کھاؤں۔ ماشہ کھاؤں یا ایک من کھاؤں۔ حکیم صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ایک مرتبہ اقبالؔ شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور سبق پڑھ رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں کتاب تھی۔ دوسرے ہاتھ میں بٹیر۔ شاہ صاحب نے پوچھا۔ کمبخت! اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بے تکلف بولے؛ حضرت ذرا پکڑ کر دیکھیے۔ شاہ صاحب ہنس دیئے۔

ایک دفعہ کسی نے ذکر کیا کہ بعض لوگ احمدیوں سے رشتہ کرنے کے لیے عارضی طور پر احمدی ہو جاتے ہیں اس لئے اب قادیان سے حکم آیا ہے کہ جب تک کوئی شخص احمدی ہو کر دو سال بطور احمدی بسر نہ کرے اس کو لڑکی نہ دی جائے۔ شاہ صاحب کہنے لگے: احمدی نہ ہوا ہڑ کا مربّہ ہو گیا!

مولوی ظفر اقبال بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ نماز کے بعد میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کا

جوتا اٹھا لیا اور لے کر چلا کہ مسجد کے باہر ان کو پہنا دوں گا۔ شاہ صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ یہ جوتا میرا ہے۔ اور میرے ہاتھ سے جوتا چھین لیا۔

سیالکوٹ میں ایک محلے کا نام کتوروں کا محلہ ہے۔ شاہ صاحب نے اس سے ایک لطیفہ پیدا کیا۔ کہنے لگے ایک دفعہ باہر سے ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا: کتوں کا محلہ کون سا ہے؟ جواب ملا: یہاں کتوں کا محلہ تو ہے نہیں البتہ ایک کتوروں کا محلہ ضرور ہے۔ وہ بولا میں کئی برس پہلے آیا تھا اور سنا تھا کہ یہاں کتوروں کا محلہ ہے۔ میں سمجھا اب تو وہ کتورے یقیناً کتے بن گئے ہوں گے!

چرچ مشن والوں نے ایک مرتبہ ایک بہشتی کو نوکر رکھا۔ ہندوؤں نے شور مچایا کہ مسلمان رکھا ہے تو ہندو بھی رکھا جائے۔ شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا: معاف فرمایئے۔ ہندو بہشتی نہیں ہو سکتا۔

شاہ صاحب وقت کے بہت پابند تھے۔ ایک دفعہ کالج کی اسٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ پرنسپل نے شاہ صاحب کو گھڑی دکھا کر کہا: مولوی صاحب آپ نے پورے دو منٹ انتظار کرایا! شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا: پھر کیا ہوا؟ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے تمہارا اس دنیا میں کتنے برس انتظار کیا ہے؟۔ پرنسپل کی عمر اسوقت ۴۵ سال تھی! اور شاہ صاحب اس سے کوئی تیس برس بڑے تھے۔

ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہیں بنا تھا۔ ینگسن صاحب پرنسپل تھے۔ انھوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ کالج کے وقت سے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کیجیے۔ شاہ صاحب ان کو عربی پڑھانے لگے۔ چند ابتدائی سبق پڑھانے کے بعد عربی کی انجیل پڑھانے لگے۔ صاحب بڑا لطیفہ باز تھا۔ پڑھتے پڑھتے کہیں اذان کا لفظ آگیا تو بولا: مولوی صاحب

ایک بات پوچھتا ہوں. خفا نہ ہونا. یہ کیا بات ہے کہ آپ کے خدا کو جب تک پانچ مرتبہ نہ پکارا جائے، وہ سنتا ہی نہیں. شاہ صاحب نے کہا کہ جی ہاں ہمارا خدا ایسا نہیں کہ ہر آٹھویں دن ٹن ٹن کی آواز سن کر خوش ہو جائے اس کے بعد اذان کی حکمت اور اس کے معنی کچھ اس انداز سے سمجھائے کہ ہنگسن بول اٹھا مولوی صاحب آپ گواہ رہیں. میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں لیکن مصلحت یہ ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے۔

جب کہ ہنگسن فوت ہوا اور شاہ صاحب اس کی کوٹھی پر پہنچے تو صاحب کی پسماندگان نے کہا کہ صاحب کی وصیت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب میری میت پر آئیں اس وقت ان کے ساتھ کوئی نہ ہو. اس کے بعد جب آپ اجازت دیں تو میت اٹھائی جائے. چنانچہ شاہ صاحب اندر گئے. اس کے لئے دعا کی اور پھر اجازت دیدی کہ میت کو دفن کر دیا جائے۔

مولانا ابراہیم سیال کوٹی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کالج جاتے وقت ایک بی ٹائم پیس دوپٹے کے پلو میں باندھ کر ساتھ لے جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سر سید آئے تو گرمیوں کا موسم تھا. لُو چل رہی تھی. شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے. سر سید نے کہا کہ کیا یہی پنجاب ہے جسے انتخاب ہفت کشور کہتے ہیں؟ شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا: جی ہاں اگر ہندوستان جنت نشان ہے تو پنجاب ضرور "انتخاب ہفت کشور" ہے۔

شاہ صاحب کو دال، آم کا اچار اور کریلے بہت پسند تھے. سفر کی حالت میں صرف کھچڑی کھاتے اور پُر تکلف کھانوں کو بالکل پسند نہ کرتے۔

میر حامد شاہ حضرت صاحب کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے ۔ یہ احمدی ہوگئے تھے ۔ جب یہ حکم ہوا کہ احمدی غیر احمدی کا جنازہ نہ پڑھے، تو کسی نے میر حامد شاہ سے پوچھا کہ کیا تم اپنے چچا میر حسن کا جنازہ نہ پڑھو گے ؟ انھوں نے مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر دعا کی الٰہی مجھے شاہ صاحب سے پہلے موت دے ۔ چنانچہ وہ پہلے فوت ہوگئے ۔ جب جنازہ تیار ہوا تو شاہ صاحب نے کہا کہ آج ہمارے خاندان سے تقویٰ اور پرہیزگاری رخصت ہوگئی ۔ حامد شاہ میرے بھتیجے تھے ۔ ان کی ساری زندگی میرے سامنے ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں نکل سکتی جس پر انگلی رکھی جا سکے ۔

علامہ اقبالؒ کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک میرے استاد کو خطاب شمس العلماء نہ دیا جائیگا، میں کوئی خطاب قبول نہ کروں گا ۔ گورنر پنجاب نے پوچھا کیا شاہ صاحب کی کوئی تصانیف بھی ہیں ؟ علامہؒ نے جواب دیا کہ ان کی تصنیف میں خود ہوں ۔

علامہ اقبالؒ نے انگلستان جاتے ہوئے جو نظم حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی درگاہ پر پڑھی، اس میں جہاں اپنے والدین اور بڑے بھائی کا ذکر کیا، وہاں شاہ صاحب کے متعلق کہا :

وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی — رہیگا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

آخری بیماری کے ایام میں شاہ صاحب کا ہندو شاگرد ہیم راج ملنے آیا ۔

وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا۔ اس وقت شاہ صاحب کے صاحبزادے سید نقی شاہ اور سید ذکی شاہ پاس بیٹھے تھے۔ ہیمراج کہنے لگا کہ علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ شاہ صاحب نے صاحبزادوں کو اٹھوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہیمراج چلا گیا تو شاہ صاحب نے صاحبزادوں کو بلا کر کہا کہ اس شخص کا خلوص دیکھو۔ تین ہزار روپے لا کر میرے قدموں میں رکھ دیئے اور کہا شاید آپ کو اس بیماری میں تکلیف ہو۔ میں نے یہ روپیہ آپ ہی کی برکت سے کمایا ہے۔ آپ اس کو قبول کیجیے۔ میں نے بہت کہہ سن کر روپیہ واپس کیا۔

شاہ صاحب نے اپنے کفن دفن کے لئے سارا خرچ الگ کر کے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنے بڑے صاحب زادے سید نقی شاہ کے تانگے میں کچھ مدت کالج جاتے رہے تھے۔ اس کے کرائے کا حساب کر کے پیسہ پیسہ ادا کر دیا یعنی وفات سے پیشتر شاگرد اور دوست تو درکنار ان کے بیٹوں کی کوئی رقم بھی ان کے ذمہ نہ تھی۔ اس پر علامہ اقبال کا وہ قصہ یاد آگیا۔ جاوید منزل کے تین کمرے علامہؒ نے اپنے بیٹے جاوید سے بعوض پچاس روپے ماہوار کرائے پر لے رکھے تھے اور کرائے کی تاریخ ۲۱ تھی۔ ہر ماہ کا کرایہ پیشگی جاوید کو ادا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت عین ۲۱ تاریخ کو انتقال ہوا۔ ایک دن کا کرایہ بھی چڑھنے نہ پایا۔

شاہ صاحب کا ایک شاگرد بہاری لال عربی و فارسی میں ماہر تھا۔ کالج والوں نے تجویز کی کہ شاہ صاحب کی جگہ اس کو پروفیسر بنایا جائے۔ وہ بے حد ضرورتمند بھی تھا۔ لیکن جب اس کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا پرنسپل صاحب میں بھوکا مر جاؤں گا لیکن اپنے استاد کی کرسی پر نہ بیٹھوں گا۔

یہ کہہ کر فوراً چلا گیا۔

حضرت سید مہر علی شاہ صاحب ۱۴ اپریل ۱۸۵۹ء کو پیدا ہوئے۔ اور ۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء کو اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو حاضر ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ نے مادہ تاریخ نکالا۔ ما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۱۳۵۶ ہجری۔ اللہ تعالیٰ استاد اور شاگرد دونوں کو علی علیین میں جگہ دے۔ اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

ساتواں باب

تصانیفِ اقبال

یوں تو علامہ اقبال ہمارے لیے اتنا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ملت کے قلوب میں سوز آرزو پیدا کرنے کے لیے صدیوں تک کام دے گا لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چند سال اور تندرستی کے ساتھ زندہ رہ جاتے تو چند ایسی بے بہا تصانیف چھوڑ جاتے جو ملت کے فکر کو صراط مستقیم پر لانے اور دین اسلام کے لازوال معارف کو دنیا کے سامنے روشن کرنے میں بڑا کام دیتیں افسوس کہ اجل نے اتنی مہلت نہ دی ورنہ وہ تشکیل فقہ جدید، حاشیہ قرآن مجید اور سفرنامہ حجاز کی صورت میں ملت کے لیے مزید ہدایات و رہنمائی کا سامان مہیا کر دیتے۔ ان کے مقالات، خطبات و بیانات بے شمار ہیں اور بعض کتابوں کی صورت میں منضبط بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتابیں چراغِ راہ کا کام دیتی رہیں گی۔* ان کے خطوط کے چند مجموعے بھی موجود ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار، ان کی ذاتی اور قومی مصروفیتوں اور ان کے تعلقات و

---

*مثلاً ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، مضامینِ اقبال، حرفِ اقبال، خطباتِ اقبال، سپیچز اینڈ سٹیٹمنٹس آف اقبال اور چند منتشر مضامین مختلف رسالوں میں۔

روابط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔* جب علامہ لاہور میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان دنوں انھوں نے اکنامکس پر اردو میں ایک کتاب لکھی جو علم الاقتصاد کے نام سے شائع ہوئی۔ لیکن چوں کہ وہ ان کی ابتدائی کوشش تھی اور اس کے بعد اقتصادیات کے نظریات و اصطلاحات وغیرہ میں خاصے تغیرات ہو چکے ہیں، اس لیے وہ اسے دوبارہ چھاپنے کے روادار نہ ہوئے بلکہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" کے عنوان سے انھوں نے جو مقالہ اپنی ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا، اس کا ترجمہ جب میر حسن الدین (حیدرآباد دکن) نے کیا تو انھیں بے حد تامل کے بعد اشاعت کی اجازت دی۔ اور لکھا کہ "یہ کتاب اٹھارہ سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی طوسی وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ ہے، جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔"

ان سرسری اشارات کے بعد ہم علامہ کی مستقل تصانیف کا تعارف کرائیں گے۔ جو چوتھائی صدی کے دوران میں دو دو چار چار سال کے وقفوں سے شائع ہوتی رہیں اور جن سے علامہ اقبال کے فکر کی عظمت کا غلغلہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔

اسرار خودی اس سے قبل لفظ "خودی" عام طور پر کبر و غرور کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا اور صرف فلسفہ و تصوف کی کتابوں میں

---

* مکاتیب اقبال شیخ عطاء اللہ۔ شاد اقبال۔ خطوط اقبال بنام جناح۔ کتاب عطیہ فیضی

نفس" کے مفہوم پر دلالت کرتا تھا اور حس کو دبانے اور مغلوب کرنے پر روحانی ارتقا کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۴ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام میں اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا اور بتایا کہ "خودی" کا حقیقی مفہوم انسان کا "انا" ہے اور یہ وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔" اس کتاب کے مختصر سے دیباچہ میں علامہ نے اس فلسفے کی توضیح کے لیے چند نکات درج کیے اور بتایا: "میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کرکے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہو۔"

رموزِ بیخودی یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی جس طرح "اسرارِ خودی" میں فرد میں احساس نفس کے نشوونما کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، اسی طرح اس کتاب میں "قومی وملی انا" کے تسلسل کو محفوظ وقائم رکھنے کے رموز واسرار بیان کیے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت دفع مضرت تعین عمل وذوق، حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کی تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل واقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے۔ اور حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں۔ تاکہ انفرادی اعمال کا تباین وتناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔ اس مثنوی میں علامہ نے ثابت کیا ہے کہ حیاتِ ملّی کے لیے بہترین ضابطہ وہ ہے جو اسلام نے مہیا

گیا ہے۔ اور اصولِ اسلامی پر تبصرہ کرکے اس نظریے کو تقویت دی ہے کہ افراد ایک خاص حد تک انفرادی "انا" کو محفوظ و قائم رکھ کر اپنی انفرادیت کو ملت کی فلاح پر قربان کر دیں۔

پیامِ مشرق اس کتاب کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ دیباچہ حسبِ معمول علامہ نے خود لکھا اور اس میں المانوی ادبیات کی تحریکِ مشرقی پر تبصرہ کرکے بتایا کہ "پیامِ مشرق" کی تربیت کا محرک جرمنی کے حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائینا لکھتا ہے کہ "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے۔" علامہ فرماتے ہیں کہ "اس کتاب کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد واقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔" آپ نے اپنے پیام میں ثابت کیا ہے کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرا ہے۔ حالاں کہ روحانیت کا درس حاصل کیے بغیر زندگی اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہو سکتی۔

بانگِ درا اگرچہ علامہ اقبال کی شہرت اردو کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی لیکن اب تک ان کی جو تین کتابیں شائع ہوئیں، وہ سب کی سب فارسی میں تھیں۔ ہر طرف سے تقاضا ہوا کہ اردو منظومات کا مجموعہ جلد از جلد چھپنا چاہیے تاکہ اردو داں حضرات مستفید ہوں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں علامہ نے "بانگِ درا" نام سے

اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا۔ اس کا دیباچہ سر عبدالقادر نے لکھا۔ جس میں اپنے قدیم تعلقات کی وجہ سے علامہ کی شاعری کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا۔ اس مجموعہ میں بعض ایسی طویل نظمیں شامل نہ کی گئیں جو انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جا چکی تھیں۔ اور بعض کے اکثر حصے قلمزد کر دیئے گئے۔ ایک حصہ ظریفانہ کلام کا بھی شامل کیا گیا۔ اس کتاب سے علامہ اقبال کی رفتارِ فکر اور ان کی شاعری کے ارتقا کا اندازہ بوجہ احسن کیا جا سکتا ہے۔

زبورِ عجم یہ فارسی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں تو قطعات و غزلیات ہیں اور دوسرے حصے میں "گلشن راز جدید" گویا سید محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ جس میں نو سوال قائم کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے اور ما وراء یات کے بعض اہم مسائل کو علومِ جدیدہ کی روشنی میں حل کر کے علمی دنیا پر اس کا اثر ظاہر کیا ہے اس کے ساتھ ہی ایک مثنوی بندگی نامہ ہے۔ جو گویا غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک مؤثر آواز ہے۔ غلامی پر عمومی اشارات کے اظہار کے بعد غلاموں اور محکوموں کے فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور مردانِ آزاد کے فن تعمیر سے روشناس کرایا گیا ہے۔ "زبورِ عجم" میں اقبال کی فارسی غزل عین الکمال کو پہنچ گئی ہے اور انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بلند سے بلند خیالات اور مؤثر سے مؤثر تلقینات کے لئے بھی غزل سے زیادہ زوردار اور زندہ صنف سخن موجود نہیں۔

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ یہ کتاب انگریزی میں ہے Reconstructions of Religious Thought in Islam

۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ ان چھ فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے مدراس اور حیدر آباد میں ارشاد فرمائے۔ علم اور روحانی تجربات۔ روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار۔ ذات واجب کا تصور اور حقیقت عادت۔ انائے انسانی اور جبر و اختیار۔ تمدن اسلامی کی روحیت۔ نظام اسلام میں روح حرکت دیعنی اجتہاد)۔ اس کتاب میں علامہ گویا ایک جدید اسلامی علم کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں۔ ان مسائل پر اسلام اور فلسفۂ جدید کی رو سے سیر حاصل بحث کر کے مفکر زمانہ حاضر کے لئے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان خطبات کا اردو ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا معلوم ہوا ہے کہ سید نذیر نیازی ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ترجمہ ہونے کے بعد بھی اس کتاب کے دقیق مطالب اردو دانوں کی سمجھ میں آسانی سے نہ آسکیں گے اور انھیں تدریس کی ضرورت پڑے گی لیکن اس میں شک نہیں کہ شاعری کے علاوہ علامہ اقبال کے منظم فکر پر آگاہی حاصل کرنا ان خطبات کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔

جاوید نامہ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے اسلام کے عقیدۂ معراج اور نظریہ جنت و دوزخ کا مطالعہ کر کے ایک طویل نظم ڈیوائن کامیڈی کے نام سے لکھی تھی۔ علامہ نے اس کا جواب لکھا ہے اور مولانا روم کی رہنمائی میں سیر افلاک کر کے مختلف منازل و طواسین طے کرتے ہوئے علامہ جمال الدین افغانی۔ سعید حلیم پاشا۔ مہدی سوڈانی۔ منصور حلاج۔ مرزا غالب۔ قرۃ العین نیٹشے۔ سید علی ہمدانی۔ غنی کاشمیری۔ بھرتری ہری۔ نادر شاہ۔ ٹیپو سلطان وغیرہم سے ملاقات اور گفت گو کی ہے۔ آخر میں خطاب بہ جاوید کے عنوان سے نژاد نو کو درس عمل دیا ہے۔ یہ کتاب حسن تخیل حسن ترتیب اور حسن بیان کے اعتبار سے علامہ کی بلند

ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

بالِ جبریل اس کتاب کی اشاعت ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اس میں رباعیات، قطعات، غزلیات اور چند منظومات جمع کی گئی ہیں۔ مدتِ دراز کے بعد علامہ نے اردو شعر کی طرف دوبارہ توجہ مبذول کی تو ملک میں بالِ جبریل کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ یہ کتاب نقادانِ سخن کے نزدیک علامہ اقبال کی اردو شاعری کی معراج ہے۔ اس کی تصنیف سے علامہ اقبال نے غزل کے دلفریب پیرائے میں وہ تمام حقائق و معارف اور تعلیمات و تلقینات بیان فرمادیں جو اس سے قبل متعدد فارسی تصانیف میں آچکی تھیں۔ اس میں ملت کو خلوص و ایقان پیدا کرنے طلسمِ مغرب سے اجتناب کرنے اور مردِ مومن بننے کی مؤثر نصیحتیں کی ہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۱۹۳۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ فارسی کی مثنوی ہے۔ اس میں پیرِ رومی اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم اہلِ مشرق کو دین و سیاست کے معانی و مقاصد سمجھاؤ۔ چنانچہ علامہ نے حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کے خصائص بتائے ہیں۔ پھر توحید، فقر، حریت، شریعت و طریقت کے اسرار و رموز اور اتحادِ اقوام کے برکات سمجھائے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور مثنوی "مسافر" بھی شامل ہے۔ جو سیاحت افغانستان کے متعلق لکھی گئی۔ اس میں بتایا ہے کہ شاعر پہلے اعلیٰ حضرت نادر شاہ شہید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر بابر، حکیم سنائی، سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوا۔ قندھار میں خرقہ مبارک کی زیارت کی۔ احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دی۔ ان تمام مواقع پر اسے جو پیغامات ملے وہ دنیائے اسلام کو پہنچائے ہیں۔

ضربِ کلیم یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فکر رنگیں اور شعر کی تر کی خوبیاں کم اور حقائق و معارف کی جولانیاں زیادہ ہیں۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے اور اب قلیل الفاظ میں کثیر المعانی حقائق بیان کرنے پر قادر ہو چکا ہے اس کے مختلف حصے ہیں۔ اسلام اور مسلمان تعلیم و تربیت۔ عورت۔ ادبیات اور فنونِ لطیفہ۔ سیاسیات مشرق و مغرب۔ محرابِ گل افغان کے افکار۔ نہایت پیچیدہ مباحث پر اس قدر سلاست، سلجھاؤ اور سہولت سے اظہارِ خیال کرنا بے حد دشوار تھا لیکن علامہ اس سے خوب عہدہ بر آ ہوئے ہیں اور "ضربِ کلیم" کے حقائق صرف ملتِ اسلامیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام و ملل کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ بقول علامہ "ضربِ کلیم ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام"۔

ارمغانِ حجاز یہ کتاب جو حضرت علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ ایک حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے اور دوسرے میں اردو کی چند نظمیں شامل ہیں۔ حضورِ حق، حضورِ رسالت، حضورِ ملت، حضورِ عالمِ انسانی۔ بہ یارانِ طریق اس کتاب کے مختلف حصے ہیں۔ اس کے اکثر قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عالمِ تصور میں حجاز کا سفر کر رہا ہے۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدت ان قطعات کی خصوصیت ہے۔ اردو کی نظموں میں بھی زمانۂ حال کے انقلابات اور تحریکاتِ فکری پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ہے۔

ختم شد